Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1965

ارشاد خداوندی

واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاوکم و ایدکم بنصرہ و رزقکم من الطیبت لعلکم تشکرون (۲۶ : ۸)

ذرا اسوقت کو یاد کرو کہ (ہندوستان میں) تم اقلیت میں تھے اور بیحد کمزور تصور کئے جاتے تھے ۔ تمہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ لوگ (ہندو) تمہیں اچک کر نہ لے جائیں ۔ ان حالات میں ہم نے تمہاری مدد کی ۔ تمہیں ایک محفوظ ٹھکانہ (پاکستان) دیا ۔ تمہیں صاحب قوت بنایا ۔ نہایت خوشگوار سامان زندگی عطا کیا ۔ یہ سب اس لئے تھا کہ (تم نے جو وعدہ کیا تھا کہ یہاں قرآن کے مطابق حکومت قائم ہو گی اس باب میں) تمہاری کوششیں بورپور نتائج پیدا کریں ۔ (لیکن تم نے اس وعدے ہی کو بھلا دیا)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت [redacted] ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے
سالانہ ——— دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۰۸۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵ سرفی گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۸ | فروری سنہ ۱۹۶۵ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

لمعات

صدرِ مملکت کے نام کھلا خط ۱۳

حقائق و عبر (۱) سیاسی بہروپئے۔ (۲) نوجوان طبقہ مذہب سے بھاگتا کیوں ہے؟ ۲۵
(۳) یہ کس قسم کا خدا ہے! (۴) ایسے کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔
(۵) اب اور جب۔
(۶) پارٹی بازی کی لعنت۔
(۷) تحریف کی انتہا۔

مومن کسے کہتے ہیں؟ محترم پرویز صاحب ۳۳

رابطہ باہمی ۶۵

باب المراسلات (۱) طلوعِ اسلام کا مسلک (۲) کیا عورت سربراہ مملکت بن سکتی ہے؟ ۶۰

آپ بیتی ڈاکٹر صلاح الدین اکبر ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سفینۂ برگِ گل بنا لیگا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ طوفاں سے پار ہوگا

خدا کا شکر ہے کہ صدارتی انتخاب کے نازک اور خطرناک موڑ سے ہمارا کاروانِ ملت بخیر و عافیت گذر گیا۔ ہمارے عوام شاید یہی سمجھتے ہوں کہ سارا معاملہ دو صدارتی امیدواروں میں سے کسی ایک کے انتخاب تک محدود تھا۔ اس طوفان میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہوئے شاید وہ اس مسئلہ کے نازک پہلوؤں کو پوری طرح سمجھنے کے قابل نہ ہوں۔ لیکن تاریخ کا مؤرخ جب مستقبل میں اس صورت حال کا تجزیہ کرے گا تو وہ بخوبی یہ بتانے کے قابل ہو سکیگا کہ جذبات سے اس طوفان میں اندر ہی اندر کیسے کیسے فتنے پرورش پا رہے تھے اور فیصلے کا رُخ اگر کوئی دوسری سمت اختیار کر لیتا تو پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو کس قدر مہیب خطرات لاحق ہو جاتے۔ ہمارا سفینۂ حیات انتشار اور تخریب کے کس ہولناک بھنور کی زد میں آجاتا۔ اور ہمارے قومی مستقبل پہ مایوسی اور شکست کی کیسی تیرہ و تار فضائیں مسلط ہو جاتیں۔

تحریکِ پاکستان کے آغاز سے لے کر صدارتی انتخاب کے حسنِ انجام تک کے واقعات و حقائق کا جائزہ لیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ اس قسم کی نازک صورت حال سے ہم پہلی بار دوچار نہیں ہوئے۔ ہماری گذشتہ ربع صدی کی پوری تاریخ کشمکش تعمیر و تخریب کی ایک داستانِ مسلسل کی صورت لئے چلی آرہی ہے۔ ہمارے قومی سفر کے دوران میں بارہا ایسے نازک اور خطرناک موڑ آئے ہیں جن کی یاد تازہ کیجئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم ان نازک مراحل کو کیوں کر

کامیابی سے طے کر آئے۔

مذہبی طبقہ کی مخالفت

حصول پاکستان کی تاریخ نگاہوں کے سامنے لائیے۔ یہ دور اس برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے حصول و قیام کی جد و جہد کا دور تھا۔ آج کوئی صاحب فکر مسلمان شاید یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہو کہ جس ملت کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے قیام کی جنگ لڑی جا رہی ہو اس کا کوئی ہوشمند فرد اس جد و جہد کی مخالفت کر سکتا ہے۔ لیکن تاریخ ببانگ دہل شہادت دے رہی ہے کہ تحریک پاکستان کی مخالفت خود مسلمانوں کی طرف سے ہوئی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے علاوہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کی جمعیۃ العلماء اور اس کے مذہبی اجارہ دار تک، مخالفت کی اس مہم میں مقدمۃ الجیش بن کا کام کر رہے تھے۔ ایک طرف ان جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا یہ سلسلہ تیزی و تندی سے جاری تھا اور دوسری طرف خود تحریک پاکستان کی علمبردار مسلم لیگ، کے اندر نقاب پوشوں کا ایک گروہ موجود تھا جو اندر ہی اندر اس تحریک کو ناکام بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس وقت کے متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات (مرحوم) جو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے، اس گروہ کے سرخیل تھے اور تحریک پاکستان کو ناکام بنانے میں افسوسناک ہتھکنڈے بروئے کار لا رہے تھے۔

سر سکندر کی سازشیں

یہ سر سکندر حیات ہی تھے جنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء (منعقدہ لاہور) کو (جس میں قرارداد پاکستان پیش کی جا رہی تھی) ناکام بنانے کے لئے اجلاس کے آغاز سے صرف دو روز قبل خاکساروں پر اندھا دھند فائرنگ سے ہنگامی صورت حال پیدا کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سنگین حالات میں مسلم لیگ کا تاریخی سیشن اور قرارداد پاکستان دونوں التوا اور بے یقینی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ لیکن قائد اعظمؒ کے عزم صمیم نے اس سازش کو ناکام بنا کر رکھ دیا۔ قدم قدم پر گھراؤ اور فائرنگ کے ہولناک ہنگاموں میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس پورے وقار اور جاہ و جلال سے لاہور ہی میں منعقد ہوا اور قرارداد پاکستان کی منظوری سے وہ تحریک پاکستان کے اس عظیم سفر کے لئے بانگ رحیل قرار دیا گیا جو مملکت پاکستان کے حصول و قیام پر منتج ہوئی۔

تحریک پاکستان کے خلاف تخریبی سازشوں کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی برابر جاری رہا۔ سر سکندر حیات پبلک جلسوں اور پرائیویٹ مجلسوں میں ہر موقع پر تحریک پاکستان کے خلاف نیش زنی بھی کرتے رہے اور عاملہ مسلم لیگ میں بھی شامل رہے۔ پھر وہ مرحلہ بھی آیا جبکہ قائد اعظمؒ کی واضح ہدایات کے خلاف، وہ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں وائسرائے بہادر کی جنگی کونسل میں شریک ہو گئے۔ اس وقت کے متحدہ بنگال کے وزیر اعظم مولوی اے۔ کے فضل الحق نے بھی (جو اس وقت مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن اور اس کے ممتاز رہنما شمار ہوتے تھے) اس معاملہ میں سر سکندر حیات کا ساتھ دیا اور اس طرح ایک نازک مرحلہ پر مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور تحریک پاکستان کو سبوتاژ کرنے کی

مذموم سازش کی۔ لیکن قائداعظمؒ کی مضبوط قیادت نے یہ سارا کھیل ناکام بنا کر رکھ دیا۔ اور تحریک پاکستان کا قافلہ ایک نئے عزم اور نئے ولولوں سے آگے بڑھ گیا۔

ملک خضر حیات کی غداری

۱۹۴۵ء میں تحریک پاکستان کو ایک اور نازک موڑ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ مرحلہ سر سکندر کے جانشین ملک خضر حیات خان کی مسلم لیگ سے بغاوت کی صورت میں سامنے آیا۔ مسلم لیگ کی صفوں سے الگ ہو کر ملک خضر حیات نے نہ صرف تحریک پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی سعی کی بلکہ وہ دشمنان تحریک کے دست و بازو بن کر قائداعظمؒ کے مقابلے میں آ گئے۔ قائداعظمؒ کے حسن تدبیر اور ملت کے عزم و استقامت نے اس نئے فتنے کو بھی شکست فاش دی اور ملک خضر حیات کو بالآخر قومی مجرم کی حیثیت سے قوم کی بارگاہ میں اپنے جرم کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن اس وقت تک ان کی غداری تحریک پاکستان کی راہ میں کافی کانٹے بکھیر چکی تھی۔

سرخپوشوں کے ہتھکنڈے

ملک خضر حیات کے اعتراف جرم کا مرحلہ ابھی مشکل سے طے ہوا تھا کہ سابق صوبہ سرحد میں ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) کا نیا مرحلہ سامنے آ گیا۔ اس مرحلہ کی نزاکت اس لحاظ سے شدید نوعیت اختیار کر گئی کہ اس صوبہ میں کانگریس کے حاشیہ بردار سرخپوشوں کی حکومت قائم تھی اور مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے بہت بڑے مخالف ڈاکٹر خانصاحب مرحوم اس حکومت کے سربراہ تھے۔ سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار نے کانگریسی آقاؤں کے اشارے پر سب سے پہلے یہ شر انگیز مطالبہ کیا کہ استصواب رائے کے سلسلہ میں پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ "پختونستان" کا ایک تیسرا نام بھی شامل کیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے خیال کے مطابق وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی شروع میں اس نئے سیاسی فتنہ کو شہ دی تھی۔ اگر یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جاتا تو مولانا مرحوم کے اندازے کے مطابق پختونستان کا قیام ممکن ہو جاتا اور سابق صوبہ سرحد پاکستان سے کٹ جاتا۔ سوچئے کہ اس صورت میں مملکت پاکستان کن مہیب خطرات میں گھر جاتی۔ لیکن قائداعظمؒ کا عزم و استقلال اس موقع پر بھی آڑے آیا۔ انہوں نے انتہائی مضبوطی سے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا اور پوری قوت سے اسے ناکام بنانے کے لئے میدان میں ڈٹ گئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ان کے عزم کے سامنے جھکنا پڑا اور اس کے بعد استصواب رائے اس سوال پر کرایا گیا کہ سابق صوبہ سرحد بھارت میں شامل ہو یا پاکستان میں۔

سرخپوشوں کی "زورلے پختون"

یہاں بھی تحریک پاکستان کا مقابلہ کانگریس یا ہندوؤں سے نہیں تھا بلکہ اس میں اصل مدمقابل صوبہ سرحد کے سرخپوش مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور یہ شرمناک سازش کی کہ بھارت کے حق میں عوام کا فیصلہ بزور حاصل کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں

کے ان بچاریوں نے تشدد، دباؤ، وحشت اور دھاندلی برپا کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبہ کے مطابق اپنی حکومت کے ذریعے آتشیں اسلحہ کے ہزاروں لائسنس حاصل کئے۔ اور "زولے پختون" کے نام پر اس آتشیں اسلحہ سے ایک جماعت مسلح کی جس نے صوبہ سرحد کے شہروں اور دیہات میں اپنی مسلح ٹولیوں کا جگہ جگہ مظاہرہ کیا۔ صوبائی دارالحکومت میں اس کے ہزاروں مسلح اور باوردی رضاکاروں کے جلوس نکلے اور وحشت اور جبر و تشدد کا وہ ماحول پیدا کیا کہ صوبہ سرحد کے مرکزی شہر بھی "سرزمین بے آئین" کی جیتی جاگتی شہادت بن گئے۔

لیکن ملت سے غداری کے یہ وحشت انگیز حربے بھی اس کے اجتماعی عزم و شعور کے مقابل اعتراف شکست پر مجبور ہو گئے اور جب ریفرنڈم کا فیصلہ کن مرحلہ آیا تو اس صوبہ کے غیور عوام فوج در فوج پولنگ اسٹیشنوں پر پہنچے اور ہر خوف اور دباؤ سے بے نیاز ہو کر انہوں نے پاکستان کے حق میں اپنی رائے پیش کر دی۔ سرخپوش میدان انتخاب سے فرار اختیار کر چکے تھے۔ ان کی مسلح "زولے پختون" اپنی موت مر چکی تھی۔ مہاتما گاندھی اور سرحدی گاندھی سے لے کر ایک ایک دشمن تحریک کی نگاہیں ناکامی، ذلت اور شکست سے جھک رہی تھیں اور سرحد کے غیور پٹھان اپنی ملت کی آرزوؤں اور امنگوں کی لاج رکھتے ہوئے اپنے صوبے کو مملکت پاکستان کا جزو لاینفک قرار دے چکے تھے۔

یہ تھی وہ آخری اور بے مثال فتح جو تحریک پاکستان کو اپنے آخری مرحلوں میں حاصل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ کانگرس نے اس موقع پر اسلامیان سرحد کے ضمیر و ایمان کا سودا کرنے کے لئے ستر لاکھ سے زیادہ رقم سرحدی گاندھی کے سپرد کی تھی۔ لیکن نہ یہ روپیہ کام آیا اور نہ زولے پختون کا وہ آتشیں اسلحہ جسے صوبہ سرحد کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا گیا تھا۔

یہ تمام مرحلے بے مثال کامیابی سے طے ہوئے۔ تحریک پاکستان بدترین سازشوں کے ہر نازک موڑ سے کامرانی اور فتح مندی کے پرچم بلند کرتی گذری اور اس کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت ابھری اور پاکستان کا وجود ایک جیتی جاگتی حقیقت بنکر نگاہوں کے سامنے آگیا۔

داخلی و خارجی سازشوں کے پے در پے طوفانوں سے گذر کر تحریک پاکستان کا قافلہ اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آگیا لیکن اس نوزائیدہ مملکت کی زندگی پہلے ہی دن سے نئی ابتلاؤں اور آزمائشوں کی زد میں تھی۔ حد بندی کے سلسلے میں ریڈکلف کے جانبدارانہ غیر منصفانہ اور سراسر غیر دیانتدارانہ فیصلے اس نئی مملکت کے لئے گہرے زخموں کے مرادف تھے۔ پاکستان کے حصے کی تمام رقوم کی ادائیگی اس نازک موقع پر انتہائی عیاری اور مکاری سے روک لی گئی۔ قتل و غارت، جور و تشدد اور وحشت و بربریت کے زور پر لاکھوں مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیل دیا گیا۔ بے بسی اور بے چارگی کے زخم خوردہ یہ لاکھوں مہاجرین ہجوم در ہجوم پاکستان کا رخ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان کی بحالی کا مسئلہ مستقل طور پر ایک دردِ سر بن گیا۔ نئی مملکت کی فوجیں مملکت سے باہر سینکڑوں میل دور پڑی تھیں۔ ملک کا روپیہ

اور اسلحہ زبردستی روک لیا گیا تھا اور اس عظیم مملکت کا نظم و نسق چلانے اور برقرار رکھنے کے لئے اس کی حکومت ہر قسم کے اسباب و ذرائع اور مالی سہاروں سے کلیتہً محروم تھی۔ بے سروسامانی کے اس عالم میں کوئی معجزہ ہی اس مملکت کو زندہ اور قائم رکھ سکتا تھا۔

یہاں بھی قائداعظمؒ کا حسن تدبر اور قوم کا عزم و استقلال آڑے آیا۔ یہ معجزہ واقعی محسوس و مشہود طور پر سامنے آیا اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود مملکت پاکستان ایک اٹل حقیقت بن کر بڑھتے ہوئے طوفانوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قابل ہوگئی۔ قائداعظمؒ کی قیادت میں اس نے ہر خطرناک سے خطرناک سازش کو شکست دی اور ہر خوفناک سے خوفناک یورش کو ناکام بنا کر رکھ دیا۔ ہمارا کاروان ملت عزم و ہمت سے تعمیر و ترقی کی منزلوں پر قدم بڑھانے لگا اور اس عزم و ہمت کے سامنے ابتلاؤں، آزمائشوں اور مایوسیوں کے بادل چھٹتے چلے گئے۔

خارجی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے ذرا آزمائی کے بعد دستور مملکت کی ترتیب و تدوین کا دور آگیا۔ قائداعظمؒ بنفس نفیس مملکت میں قرآنی نظام کا قیام چاہتے تھے۔ چند سال قبل انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی ایک تقریب میں صاف اور واشگاف انداز میں یہ فرمادیا تھا کہ

> اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے۔ نہ پارلیمان کی اور نہ کسی اور شخص اور ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی کارفرمائی کا دوسرا نام ہے۔

یہی تھا وہ واحد راستہ جو پاکستان کو خالص اسلامی نظام کی منزل مقصود تک پہنچا دیتا۔ اور اس طرح ہم قرآن کی عطا فرمودہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کے دائرے میں باہمی مشاورت سے وقت کی ضرورتوں اور حالات کے تقاضوں کے مطابق مملکت کے لئے جزئی قوانین کی تدوین کئے چلے جاتے اور دنیا پر علی وجہ البصیرت یہ ثابت کر دیتے کہ اسلام کا مثالی نظام کس قدر ترقی پذیری کی خصوصیات کا حامل ہے اور اس طرح دنیا کے ہر حصے اور ہر گوشے میں قابل عمل۔

تھیا کریسی کی گرفت

لیکن قائداعظمؒ کے سانحۂ رحلت کے بعد یہ بنیادی حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اور دستور مملکت کا اہم ترین مسئلہ سیاست دانوں کی ہوس اقتدار کے باعث بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی صورت اختیار کر گیا اور ان لوگوں نے مذہبی طبقوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے عجیب و غریب ہتھکنڈوں کا آغاز کر دیا۔ آئین سازی کی ترتیب و تدوین میں دستور یہ کو اسلامی امور میں ضروری امداد مہیا کرنے کے لئے "تعلیمات اسلامی بورڈ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے کا کام محض مشورہ دینے تک محدود تھا۔

اور دستور کی تکمیل سے اس کی ضرورت اور ذمہ داری ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن جب بنیادی حقوق کی رپورٹ منظر عام پر آئی تو اس میں ایک شق کے ذریعہ یہ سفارش کی گئی تھی کہ "علماء بورڈ کے نام سے ایک ایسے مستقل ادارے کی تشکیل عمل میں لائی جائے جو اسمبلیوں میں منظور شدہ ہر قانون کی تصدیق یا استرداد کا مجاز اور مختار ہوگا۔ بالفاظ دگر اس بورڈ کے فیصلوں کو قانون سازی میں حرف آخر کی حیثیت حاصل ہوگی۔ سیاسی مصلحت کوشیوں کے تحت یہ تھا وہ پرخطر اقدام جو ملک پر تھیاکریسی مسلط کرنے کے مرادف تھا۔ سوچئے کہ اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تو تھیاکریسی کے فولادی شکنجوں میں جکڑے جانے کے بعد اس مملکت کا حشر کیا ہوتا۔ مذہبی پیشوائیت کو نظام مملکت پر مسلط کرنے کے جو مہیب نتائج تاریخ انسانی میں سامنے آئے ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس تھیاکریسی کی خون آشامی سے مذہب اور خدا کے مقدس نقاب میں نوع انسانی پر ظلم و استبداد کی جو دو دھاری تلوار چلائی گئی اور خون کے جو دریا بہائے گئے، سیاسی آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کے حصے میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں آیا۔ اور پاکستان میں اس کے ہاتھوں جو تباہی مچتی اس کے تصور سے بھی دل لرز اٹھتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ پاکستان اس قیامت خیز حادثے سے بھی بچ گیا۔ اسوقت کے گورنر جنرل غلام محمد (مرحوم) نے صورت حال کی نزاکت کو بروقت محسوس کیا اور دستور ساز اسمبلی کے خاتمے سے یہ سارے جال توڑ پھوڑ کر پھینک دیئے۔

سیاسی استحکام کا خاتمہ

لاریب کہ پاکستان کو تھیاکریسی کے چنگل سے نجات مل گئی لیکن سیاسی مہرہ بازوں کی طالع آزمائیاں بساط سیاست پر برابر جاری رہیں۔ مرکزی اور صوبائی وزارتیں ان مہرہ بازیوں کی بھینٹ چڑھتی رہیں۔ آئے دن حکومتوں کے تختے الٹتے رہے۔ نظام حکومت میں نت نئے تہلکے برپا ہوتے رہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا سیاسی استحکام ختم ہو گیا۔ قوم حقیقی نمائندوں اور کارفرمائی کی سیادت و قیادت سے محروم ہو گئی۔ یوں نظر آتا تھا گویا ایک غول بیابانی پوری قوم پر عذاب الیم بن کر مسلط ہے اور شب و روز اسکی توانائیوں کو مضمحل کئے جا رہا ہے۔ چنانچہ ہر لمحہ یہ اندیشہ شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ یہ کشتی اب ڈوبی کہ ڈوبی۔

طلوع اسلام کی تجویز

اس نازک مرحلہ پر مملکت کو خطرات کے ہجوم سے بچانے کیلئے طلوع اسلام نے یہ آخری تجویز پیش کی کہ:-

> اگر صورت حال کو کچھ عرصہ اسی طرح رہنے دیا گیا تو حکومت کی مشینری میں انارکی پھیل جائیگی۔ لہٰذا حالات ہمیں خود بخود اس منزل تک لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اس "جمہوری تماشے" کو ختم کر کے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے، اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دیدیا جائے۔ تاکہ انتخابات پرامن اور منظم فضا میں تکمیل تک پہنچ سکیں۔ طلوع اسلام، لحات شمارہ اکتوبر ۱۹۵۷ء

عسکری انقلاب

یعنی طلوعِ اسلام کی تجویز یہ تھی کہ ملک کی گاڑی کو جس دلدل میں پھنسا دیا گیا تھا، فوج کی قوت بازو اسے وہاں سے نکال دے، تاکہ اس کے بعد وہ اپنے معمول کے مطابق آگے بڑھنے کے قابل ہو سکے۔

دن گذرتے گئے اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے تاآنکہ جب پانی سر سے گذر گیا تو عساکر پاکستان کے کمانڈر ان چیف نے آگے بڑھ کر ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ یہ فوجی انقلاب دوسرے ملکوں کی طرح ہیبت انگیز اور خون آشام اقدامات پر منتہی آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ قائد انقلاب، صدر محمد ایوب خان نے جب دیکھا کہ ملک میں اب فوجی نظم و نسق کی ضرورت نہیں رہی تو انہوں نے پھر سے اس گاڑی کو آئینی شاہراہ پر ڈال دیا۔ حتیٰ کہ صدارتی انتخاب کا اہم مرحلہ سامنے آ گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب قوم کو اپنے اس حق کے استعمال کرنے کا اختیار حاصل ہوا کہ وہ سربراہ مملکت کا انتخاب اپنی صوابدید کے مطابق خود کرے۔

ملک دشمنوں کا گٹھ جوڑ

ملک میں ایسے عناصر شروع سے ہی چلے آ رہے ہیں جنہیں پاکستان کی سالمیت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ فوجی نظام کے دوران میں ان کی سرگرمیاں دبک کر زیر زمین چلی گئیں۔ جب اس کا تسلط اٹھا تو یہ پھر ایک ایک کر کے باہر آتی چلی گئیں۔ یہ ایسے موقع کی تلاش میں تھیں جب وہ قوم سے اپنی شکست کا انتقام لیں۔ یہ موقع صدارتی انتخاب نے بہم پہنچا دیا۔ چنانچہ یہ قوتیں یکجا ہوئیں اور جمہوریت کے نام پر ایک متحدہ محاذ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ ان میں واضح اکثریت ان عناصر کو حاصل تھی جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں دن رات ایک کیا تھا، یعنی صوبہ سرحد کے سرخپوش، جماعت اسلامی کے صالحین، سابق یونینسٹ پارٹی کے بڑے بڑے جاگیردار اور خلاف قانون کمیونسٹ پارٹی کے شہسوار، جو اب نیشنل عوامی پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے تخریبی ہنگاموں کو ہوا دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ تمام عناصر اس موقع پر ایک متحدہ محاذ کی شکل میں گٹھ جوڑ سے میدان میں آ گئے اور ملک کی بدقسمتی سے انہیں قائد اعظمؒ کی ہمشیرہ کو آگے بڑھا کر اپنی سپر بنانے کا موقع مل گیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ہمارے ہاں عام روش ہو گئی ہے کہ حزب مخالف کو ملک کا دشمن اور پاکستان کا مخالف قرار دے کر بدنام کر دیا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ روش عام ہے یا خاص۔ لیکن ہم ملک کے ہوشمند طبقہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جن جماعتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہ پارٹیاں شروع سے تحریک پاکستان کی مخالفت کرتی رہیں۔ اور تحریک پاکستان کے بعد بھی مسلسل اور متواتر ملک میں انتشار پھیلاتی رہیں۔ آپ کونسل مسلم لیگ کو اس سے مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن سوچئے کہ اس متحدہ محاذ میں اس بیچاری کی حیثیت کیا تھی! پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ اس لیگ کو قائد اعظمؒ کی لیگ کہا جاتا ہے۔ لیکن قائد اعظمؒ کی اس (مزعومہ) لیگ کی کیفیت یہ تھی کہ اس کی صدارت قائد اعظمؒ کی ہمشیرہ کے حصے میں نہ آ سکی۔ اگر انہوں نے

اسے خود قبول نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسے قائد اعظمؒ کی لیگ نہیں سمجھتی تھیں، اور اگر اس لیگ نے انہیں اس قابل نہیں سمجھا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لیگ اپنے آپ کو قائد اعظمؒ کی لیگ نہیں سمجھتی تھی۔ صورت خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ اس محاذ میں اس لیگ کی پوزیشن غاشیہ برداروں کی سی تھی۔ مؤثر جماعتیں وہی تھیں جو شروع سے پاکستان کی مخالفت چلی آ رہی تھیں۔

طلوعِ اسلام کا موقف

صدارتی انتخاب میں ایک طرف صدر ایوب تھے اور ان کے مقابلے میں ان عناصر کا تخریبی گٹھ جوڑ جن کا کردار سابقہ سطور میں سامنے آ چکا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس متحدہ محاذ کی کامیابی کا نتیجہ سوائے ملکی تخریب اور تباہی کے اور کچھ نہ ہوتا۔ اس لئے اس موقع پر بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان کو ان حالات میں محفوظ کیونکر رکھا جائے۔ جمہوریت کی بحالی کا نعرہ ہو یا تعمیر و ترقی اور اصلاح کے کوئی دوسرے منصوبے۔ ان سب کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو۔ اگر مملکت کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے تو پھر سوچئے کہ ان منصوبوں پر عمل درآمد کہاں ہو گا۔

جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے اس کے اوراق شہادت دیں گے کہ اس نے اگر تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تو کسی فرد یا پارٹی کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ قرآنی نظام کے لئے ایک خطۂ زمین کی ضرورت ناگزیر ہے، اس دور میں اس نے ان تمام افراد اور جماعتوں کی مخالفت کی جو تحریکِ پاکستان کے خلاف مختلف بھیس بدل کر میدان میں آئیں۔ اور ان تمام کوششوں کا بخلوصِ قلب ساتھ دیا جو اس تحریک کی کامیابی کے لئے عمل میں آتی رہیں۔

حصولِ پاکستان کے بعد بھی طلوعِ اسلام کے سامنے ایک بنیادی مقصد رہا اور وہ مقصد یہ تھا کہ اس خطۂ زمین کو جسے قرآنی نظام کی اساس و بنیاد بنانا مقصود ہے ہر قسم کی تخریبی سازشوں اور مذموم عزائم سے محفوظ رکھا جائے۔ اس مدت میں اس کی ایک ایک تحریر کا جائزہ لیجئے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ حزبِ اقتدار ہو یا حزبِ مخالف، مسلم لیگ ہو یا کوئی دوسری پارٹی جس فرد یا گروہ نے بھی پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش کی طلوعِ اسلام نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور ملکی سالمیت کے خلاف ایسی سرگرمیوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ہر اس کوشش کی تائید میں ہاتھ اٹھایا جو پاکستان کی سالمیت کے لئے کی گئی۔ خواہ یہ کسی گوشے سے ابھری ہو۔

حالیہ صدارتی انتخاب میں بھی صورتِ حال اسی قسم کی تھی اور طلوعِ اسلام کی روش بھی اسی نقطۂ نظر کی آئینہ دار۔

ہم مطمئن ہیں کہ صدر ایوب کی کامیابی سے ملک ایک بہت بڑے خطرہ سے بچ گیا یہ سرزمین ایک بار پھر اس تخریبی گٹھ جوڑ اور اس کی مہیب سازشوں سے محفوظ ہو گئی جو متحدہ محاذ کی کامیابی کی صورت میں سامنے آتیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ گذشتہ سترہ برس میں ہم ان مقصود و منتہٰی کی طرف بڑھنے کے قابل نہ ہو سکے جن کی خاطر یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا

کیونکہ یہ سترہ برس اس سعی و کوشش ہی کی نذر ہو گئے کہ اس سرزمین کو داخلی اور خارجی سازشوں سے محفوظ کیوں کر رکھا جائے۔ بہر حال یہ مقام تشکر و امتنان ہے کہ ان تمام سازشوں کے باوجود جو پاکستان کی سالمیت کو ختم کرنے کے لئے معرضِ وجود میں آئیں یہ ملک محفوظ رہا۔ اور آج ہم اس قابل ہیں کہ جن عظیم مقاصد کی خاطر اسے حاصل کیا گیا۔ ان کے حصول کے لئے مثبت قدم اٹھائے جائیں۔ اس سلسلہ میں صدرِ مملکت پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی طرف ہم نے اس کھلی چٹھی میں اشارہ کیا ہے جس سے ہم نے محترم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب سے خطاب کیا ہے اور جسے آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ خدا کرے کہ وہ ہماری گذارشات کو درخورِ اعتناء تصور کر کے انہیں عملاً متشکل کرنے کی طرف قدم اٹھائیں تاکہ وہ اس عظیم ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکیں جو اس انتخاب جدید سے ان پر عائد ہوئی ہے اور کاروانِ ملت اس منزل کی طرف جادہ پیما ہو جو اس کا منتہائے نگاہ ہے۔

۲۔ کراچی کے تازہ فسادات

پاکستان کے صدارتی انتخاب کے سلسلے میں مسلسل دو ڈھائی ماہ تک جو اشتعال انگیز مہم ملک کے طول و عرض میں جاری رہی اس نے عوام کے جذبات کو شعلوں کی صورت بھڑکا دیا تھا۔ اور یہ اندیشہ ہائے دور و دراز دلوں میں لرزشیں پیدا کر رہے تھے کہ پتہ نہیں یہ لاوا کب پھوٹ نکلے اور ملک کا امن و امان اور سالمیت اس کی زد میں آ جائے۔ جوں جوں انتخاب کی ساعت قریب آتی جا رہی تھی یہ اندیشے بھی شدت اختیار کئے جا رہے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ صدارتی انتخاب کا دن آیا اور یہ مرحلہ اس نظم و ضبط اور امن و اطمینان سے طے ہوا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس حسنِ انتظام کو جس قدر خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے کہ ملک کے ہر گوشے میں پولنگ کا سلسلہ امن و امان سے تکمیل کو پہنچا۔ اور یہ سب کچھ اس قابل تھا کہ اس کے لئے ہم حکومت، حزبِ اختلاف اور عوام سب کو مبارکباد پیش کرتے لیکن ع

من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

یہ متوقع خطرہ تو امن و اطمینان سے ٹل گیا لیکن اس کے بعد فتنہ و فساد کے شعلے اگر بھڑکے تو کراچی جیسے مرکزی شہر میں۔ اس شہر سے آمدہ اطلاعات کے مطابق وہاں وحشت و بربریت کے جو واقعات رونما ہوئے انہوں نے صدارتی انتخاب کا شاندار ریکارڈ داغدار کر کے رکھ دیا۔ کراچی کے یہ واقعات اور حادثات اس قدر افسوسناک ہیں کہ پوری قوم کا سر فرطِ ندامت سے جھک گیا ہے۔ اور اس سے قبل امن و امان کی جو درخشاں مثال قائم ہوئی تھی اس کی قدر و قیمت بھی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس وقت یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس فتنہ و فساد کا ذمہ دار کون ہے اور جب تک

تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ سامنے نہ آئے ہم اس بارے میں اظہار خیال سے معذور ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ صورت حال حکومت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کر رہی ہے۔ اور اس پر لازم ہے کہ تحقیقات کے بعد جو لوگ مجرم ثابت ہوں انہیں اس قدر عبرتناک سزائیں دی جائیں کہ آئندہ کے لئے کسی کو ایسے اقدامات کی جرأت ہی نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ حکومتوں اور ان کے نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر قائم ہوتی ہے۔ فسادات کی تحقیقات کا مرحلہ ہو یا مجرموں کو سزا دینے کا، دونوں حالتوں میں، عدل و انصاف کا کڑا معیار پیش نظر رہنا چاہیئے۔ مجرم افراد یا عناصر کسی گروہ سے متعلق اور کیسی ہی پوزیشن کے مالک ہوں کسی کے ساتھ بھی ادنیٰ رو رعایت روا رکھنا عدل و انصاف کے مقدس تقاضوں کو داغدار کر کے رکھ دیتا ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو بے گناہ لوگ اس جرم میں گھسیٹ کر لائے جا سکیں اور نہ کسی مجرم کو بچانے میں کسی کا اثر کام دے سکے۔ اور ہر مجرم کو سزا اس کے جرم کے مطابق دی جائے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اگر ہماری کتاب سیاست کا یہ دور اس قسم کے مثالیہ عدل کے باب سے شروع ہوا تو اس سے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہونگے۔ اور اگر اس میں خدا نکردہ کہیں کوئی جھول رہ گئی تو اس کے عواقب بھی کم مضرت رساں نہیں ہونگے۔ سچ ہے حکومت کا اقبال کہتے ہیں اس کی بنیادیں عدل پر استوار ہوتی ہیں۔

---

۳ ۔ خارجہ پہلو

گذشتہ انتخاب صدر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندوستان بڑی دلچسپی لے رہا تھا وہاں کے اخبارات مسلسل محترمہ مس فاطمہ جناح کے حق میں پراپیگنڈہ کر رہے تھے۔ اخبارات میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ وہاں سے بہت سا لٹریچر مشرقی پاکستان آیا تھا۔ آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ یہ لٹریچر مشرقی پاکستان کی طرف کیوں بھیجا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی پانچ کروڑ آبادی میں قریب ایک کروڑ ہندو ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا "قطب نما" بھارت ہی ہے۔ یہ اپنے "قبلہ" کا رخ اسی کے مطابق متعین کریں گے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اس آبادی کے تناسب سے مشرقی پاکستان کے چالیس ہزار اراکین بنیادی جمہوریت میں قریب آٹھ ہزار ہندو ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر وہ اتنے نہ بھی ہوں تو بھی ان کی تعداد بڑی کثیر ہو گی۔ قرائن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ووٹ محترمہ مس فاطمہ جناح کے حق میں گئے ہونگے۔ یعنی انہوں نے مشرقی پاکستان سے جو قریب اٹھارہ ہزار ووٹ حاصل کئے ہیں ان میں ہزارہا ووٹ ان ہندو اراکین کے ہونگے۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگایئے کہ آپ کے ملک کی پالیسی کا رخ بدلنے میں ان ہندوؤں کا کتنا بڑا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا کہ اسلام کی رو سے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے خواہ یہ دونوں ایک ہی ملک میں کیوں نہ بستے ہوں۔ اور پاکستان بننے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ نہیں!

ایک ملک میں بسنے والے ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم کے افراد ہوتے ہیں ـــ اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

فیها آیات لقوم یتفکرون۔

---

۴ ـــ مغربی جمہوریت کی لعنت

اب پاکستان کی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کی باری ہے۔ بنیادی جمہوریت کے الیکشن کے وقت کسی پارٹی نے امیدواروں کو ٹکٹ نہیں دیئے تھے۔ لیکن اب کنونشن مسلم لیگ کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ انہوں نے انتخابی بورڈ مقرر کرلئے ہیں اور انہوں نے امیدواروں سے درخواستیں بھی طلب کرلی ہیں تاکہ وہ امیدواروں کو اپنے ٹکٹ پر کھڑا کریں۔ اس حقیقت کے اعتراف میں دو آراء نہیں ہوسکتیں کہ ٹکٹ اس امیدوار کو ملنا چاہیئے جو اس منصب کا اہل ہو ـــ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ امور سیاست سے واقف۔ عمدہ کیریکٹر کا حامل۔ وہ جس کی اصابت رائے اور دیانت و امانت پر بھروسہ کیا جاسکے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مغربی جمہوریت کا تقاضا ہوگا کہ ٹکٹ اس امیدوار کو دیا جائے جس کی کامیابی کے امکانات واضح ہوں۔ اس لئے کہ اس جمہوریت میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں ـــ تولا نہیں کرتے۔

اسی لئے کوئی پارٹی اس کا (R I S K) نہیں لیتی کہ قابلیت اور کیریکٹر کے معیار پر اپنی اکثریت کے امکان کو قربان کردے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس مرحلے سے ہنوز ہمارا ملک گزر رہا ہے اس میں ووٹوں کی اکثریت بالعموم کس قسم کے امیدواروں کے پیچھے ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طریق جمہوریت کی رو سے جس قسم کے امیدوار منتخب ہوکر آسکتے ہیں ان سے کون واقف نہیں۔ اس کے بعد اس بات کو دہرانا کہ ہماری اسمبلیوں میں کس قسم کا عنصر آجاتا ہے فضول ہے۔ یہ سب مغربی جمہوریت کی لعنت کا تصدق ہے جسے اب ہمارے ہاں بدقسمتی سے "عین اسلام" قرار دے کر اس کی بحالی کیلئے جہاد کیا جا رہا ہے!

اس ضمن میں ہم محترم صدر مملکت سے گذارش کریں گے کہ اگر ارکان اسمبلی کے انتخاب کے سلسلہ میں وہ معذور ہیں کہ اس کا فیصلہ رائے دہندگان کرتے ہیں تو ـــــ صدارتی نظام میں وہ اپنی کابینہ کے انتخاب میں تو آزاد ہیں۔ لہٰذا اگر وہ اپنی موجودہ کابینہ میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں یا اس میں اضافہ کریں تو کم از کم اس انتخاب میں وہ اس معیار کو پیش نظر رکھیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ صدارتی نظام میں یہی تو ایک خوبی ہے کہ اس میں وزراء کا انتخاب، اصول اور معیار کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ ووٹوں کی اکثریت کا پابند نہیں ہونا پڑتا ـــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشرف نظر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب بالقابہٗ

صدر مملکت پاکستان

صدر محترم۔ سلام و رحمت۔

ہمارا سر سپاس بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے کہ اس نے ایک بار پھر اس خطۂ زمین کو انتشار پسندی اور تخریب انگیزی سے بچا لیا اور یوں ہمیں ایک اور موقع دے دیا کہ ہم اُس مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہوں جس کی خاطر اس مملکت کا وجود عمل میں لایا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں — یعنی اس خطۂ زمین کے تحفظ کے لئے — جس قدر جد و جہد آپ نے کی ہے اس کے لئے ملک کا ہر فرد خواہ آپ کا شکر گزار ہے — اب جبکہ انتخاب کا ہنگامہ فرو ہو چکا ہے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ وقت کے لئے ہم کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیں اور سوچیں کہ ہمیں آئندہ کیا کرنا چاہیئے — ماضی میں جو کچھ ہوا، ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مستقبل کے لئے ہمارا پروگرام کیا ہونا چاہیئے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں، اِس امید کے ساتھ کہ آپ انہیں اپنی توجہ کا مستحق سمجھیں گے۔

آئینِ پاکستان

۲۔ جس طرح اس خطۂ زمین کا حصول ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا، اسی طرح، منصبِ صدارت بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ اس سرزمین میں صحیح قرآنی نظام قائم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم، اولیں اور اساسی سوال آئینِ پاکستان کا ہے۔ کسی مملکت کے آئین میں بنیادی نکتہ یہ ہوتا ہے کہ مملکت کیلئے

قانون سازی کا اصول کیا ہے۔ باقی تمام تفاصیل اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اگر ہماری مملکت سیکولر ہوتی تو اس مسئلہ کا حل کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مغرب کے جمہوری انداز کے مطابق، مجلس قانون ساز (پارلیمان) کی اکثریت جو فیصلے کرتی وہی مملکت کے قوانین بن جاتے۔ لیکن جس مملکت کا وجود ایک آئیڈیالوجی کی رو سے عمل میں آیا ہو۔ اور اُس آئیڈیالوجی کی حیثیت اُس کے دین اور ایمان کی ہو ـــــ اُس میں قانون سازی کا یہ اصول، کسی صورت میں کارفرما نہیں ہو سکتا۔ اُس میں مجالس قوانین ساز کے اختیارات غیر محدود نہیں ہوتے بلکہ اُس کی آئیڈیالوجی کے حدود کے اندر مقید ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اس مملکت کے آئین کی پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان حدود کا تعین کرے جس کے اندر رہتے ہوئے مملکت کا قانون وضع کیا جا سکتا ہے۔

قانون سازی کا اصول

۳ـــ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کے اس اصول کو آپ خود اپنے بیانات اور تقاریر میں اس طرح واشگاف کر چکے ہیں کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔ (مثلاً) آپ نے، پاک بحریہ کے دورہ کے سلسلہ میں، ۱۸ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ایک مقام پر فرمایا تھا:-

> جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد آپ نے، ۱۸ جولائی ۱۹۶۰ء کو، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں۔ اور جن طریقوں سے انہیں عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کونسی باتیں غیر متبدل ہیں اور کونسی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

اور اس امر کی وضاحت بھی آپ نے خود ہی کر دی تھی جب آپ نے ۱۹۶۱ء میں، عید الاضحیٰ کی تقریب پر ملک کے نام

اپنے نشریہ میں فرمایا تھا کہ:۔

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرمادیا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، پاکستان میں قانون سازی کے اصول کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی:۔

جو احکام، قوانین، اصول اور حدود قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔ ان قوانین کی مزید جزئیات اور ان اصولوں کی تفصیلات، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہم خود مرتب کر سکتے ہیں۔ ان جزئیات اور تفاصیل میں، زمانے کی ضرورتوں کے اعتبار سے، تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن جو کچھ غیر متبدل ہے اس میں تبدیلی کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔

یہ ہے قانون سازی کا وہ اصول جسے ہمارے آئین کے اندر داخل ہونا چاہیئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا ہماری مملکت کے لئے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے اسلامی کہا جا سکے۔ اس امر کی شہادت خود یہ تلخ حقیقت ہے کہ مملکت کو وجود میں آئے قریب اٹھارہ سال ہو گئے لیکن ابھی تک اس کا کوئی ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوا۔ اس ضمن میں جس قدر کوششیں ہوئیں وہ سب بے نتیجہ رہیں، اس لئے کہ ہمارے آئین میں قانون سازی کی یہ اصل ہی گم تھی۔ جب تک یہ اصل، آئین کے اندر داخل نہیں کی جائے گی، وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا جس کے لئے اس مملکت کو متشکل کیا گیا تھا۔

علم و بصیرت اور غور و تدبر

۳۔۔۔ آئین میں اس تبدیلی کے بعد سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ مملکت کے مسائل، علم و بصیرت اور فکر و تدبر کی رو سے حل کئے جائیں۔ یہ وہ ضرورت ہے جس کا احساس آپ نے بہت پہلے کر لیا تھا۔ چنانچہ ہر جولائی ۱۹۵۹ء کو آپ نے، مری میں، کمشنرز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔

اس سلسلہ میں، ہمارے راستے میں جو چیز سنگِ گراں بن کر حائل ہو رہی ہے؛ اس کی تشریح بھی آپ متعدد مواقع پر نہایت وضاحت سے کر چکے ہیں۔ چنانچہ آپ نے، مئی ۱۹۵۸ء کو، دارالعلوم دیوبند (انڈیا) میں، "علماء" سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا؛

> جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی تو بہر حال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے۔ نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب، زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے، مسجدوں، خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے لیکن ہمارا مذہب، صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بت بنا دیا۔

اس تبدیلی کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا؛

> مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے، یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصرِ حاضر کی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا ان پر "دنیا دار" ہونے کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں، جمود و سکوت کے مجسمے بن کر رہ گئے، وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے، اسلام سے منحرف اور برگشتہ شعار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس و دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام۔ ہر نئی ایجاد۔ ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔

حریتِ فکر و نظر کی یہ کتنی وہ اہمیت جس کی شدت کا احساس کرتے ہوئے آپ نے ہی ۱۹۶۲ء میں، کراچی میں، ارباب دانش و بینش کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پامال راہوں کو چھوڑ کر نئی راہیں اختیار کرنی ہوں گی۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم کبھی اس رفتار سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے جس سے ہمیں بڑھنا چاہیئے۔ میں، درحقیقت، فکر کی دنیا میں، زیادہ سے زیادہ "ملحد" دیکھنا چاہتا ہوں۔

لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ آزادیٔ فکر و نظر پر پہلے سے بھی زیادہ سنگین پہرے لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کو اس کی جرأت نہیں ہوتی کہ جو کچھ وہ کمروں کے اندر کہتے ہیں اسے دروازے سے باہر نکل کر دہرا سکیں۔ اس قدغن کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے سینوں میں دل سہمے ہوئے ہیں اور وہ منافقت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ جو ذرا سی جرأت کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اس پُرہجوم معاشرہ میں تنہا پاتا ہے جس کی وجہ سے قدامت پرستی کی قوتیں اس پر چاروں طرف سے جھپٹ پڑتی ہیں۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ ہم فکر کی دنیا میں، اپنے دورِ غلامی کے مقام سے بھی پیچھے ہٹ چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری فکر (مغرب کی طرح) بدلگام نہیں ہو سکتی۔ اسے قرآن کی متعین کردہ حدود کے اندر ہی آزادی مل سکتی ہے ــــ وہ میدان بڑا وسیع ہے ــــ لیکن یہاں تو حالت یہ ہے کہ قوم کا طبقۂ جہلائے فکر کی راہوں پر رہزن بن کر بیٹھا ہے اور اس کا اعلان یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے جس نے اس سے ذرا سا بھی اختلاف کیا، اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔

جب تک ملک میں ایسے حالات پیدا نہ کئے جائیں جن سے صحیح فکر کی راہیں کشادہ ہوں، ہماری ہزار مادی ترقی بھی ہمیں انسانوں کی صف میں، کھڑے ہونے کے قابل نہیں بنا سکے گی۔ اس سلسلہ میں کرنے کا کام یہ ہے کہ

> (۱) مذہب کے نام پر جو دہشت فضا میں پھیلا دی گئی ہے اور پھیلائی جا رہی ہے، اسے ختم کیا جائے۔ اور
> (۲) آنے والی نسلوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کیا جائے۔

تعلیم کا مسئلہ

(۲) ۔ قوموں کے مستقبل کا مدار کس طرح صحیح تعلیم پر ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو خود اس کا پورا پورا احساس ہے۔ آپ نے اپنے مشرق وسطیٰ کے دورہ پر قاہرہ اور جدہ میں تقاریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصر حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسے آگے بڑھاتے جائیں...... اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود و تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر تحقیق کریں۔ اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں، زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

یہ تھا ہمارے کرنے کا کام۔ لیکن اس ضمن میں بھی ہمیں پھر اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ ہم ابھی مقام پر کھڑے ہیں جہاں ہم انگریز کے زمانے میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی چار قدم پیچھے۔ اس زمانے میں ہمارے دینی مدرسے الگ ہوتے تھے اور دنیاوی مدرسے الگ۔ دنیاوی مدرسوں میں، گورنمنٹ اسکول اور کالج الگ ہوتے تھے اور اسلامیہ اسکول اور کالج الگ۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ اسلامیہ اسکولوں میں ایک پیریڈ دینیات کا ہوتا تھا۔ جس میں "مسئلے مسائل" پڑھائے جاتے تھے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ہمارا نظام تعلیم اس وقت بھی اسی راستے پر نہیں چلا جا رہا؟ باقی رہا یہ کہ ہم اس مقام سے بھی چار قدم پیچھے ہیں، سو وہ اس طرح کہ پہلے ہماری "دینی تعلیم" پرائیویٹ انتظامات کی رہین کرم ہوتی تھی۔ اب اسے خود حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اوقاف کا اس قدر روپیہ (جو پہلے صرف ضائع جاتا تھا اب) ابھی توہم پرستی اور قدامت پسندی کی ترویج اور فروغ کے لئے صرف کیا جاتا ہے جسے آپ نے قوم کی تباہی کا موجب بتایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حدود پاکستان کے اندر تقسیم ہند کے وقت جس قدر مذہبی درسگاہیں تھیں آج اُن کی تعداد اُس سے کئی گنا زیادہ ہے۔

جب حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں ثنویت نہیں تو پھر ہمارے نظام تعلیم میں دینی مکاتب اور دنیاوی درسگاہوں کی تفریق۔ اور دنیاوی درسگاہوں میں مذہب کی تعلیم کے لئے ایک الگ پیریڈ کی تخصیص چہ معنی دارد؟ ہمارے نظام تعلیم کی بنیاد اس اصول پر ہونی چاہیئے کہ ہم طالب علموں کو سائنس پڑھائیں، یا فلسفہ تاریخ کی تعلیم دیں یا سیاسیات کی۔ معاشی علوم کا نصاب زیر تدریس ہو یا معاشرتی کا۔ طلبا کو بتایا یہ جائے

کہ ان علوم کو قرآن کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ اور ان کی رو سے حاصل کردہ قوتوں کو وحی کی منشاء کے مطابق، نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اسلام کی روح، اس پوری تعلیم کے رگ و پے میں اس طرح حلول کر جائے گی جس طرح ہماری فکر و دانش پیچیدہ معاملات کے حل کرنے کی کوششوں میں غیر محسوس طور پر کارفرما ہوتی ہے۔ باقی رہی فقہ (یعنی اسلامی قانون) کی تعلیم — جسے آجکل "مسئلے مسائل" کہا جاتا ہے سو اس کا مقام "لاء کالجز" ہیں۔

> لہٰذا نظامِ تعلیم میں اس انقلابی تبدیلی کے لانے کے لئے جس کی طرف آپ نے اپنی محولہ بالا تقریر میں اشارہ کیا تھا، اولیں قدم یہ ہے کہ جداگانہ مذہبی تعلیم کی درسگاہوں کو بند کیا جائے اور دین کی تعلیم کو، دنیاوی تعلیم کے عروق میں خونِ زندگی بنا کر دوڑا دیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی انقلابی تبدیلی کے لئے جراءتِ رندانہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن جب آپ کو یقین ہے کہ قوم کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے سوا کوئی اور نہیں تو پھر اس..... تبدیلی کے راستے میں کسی بات کو حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ قابلِ سرجن کا ہاتھ نشتر اٹھاتے وقت کبھی کانپا نہیں کرتا۔

روٹی کا مسئلہ

(۵) لیکن یہ ساری تبدیلیاں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسی صورت میں ثمر بار ہو سکتی ہیں جب قوم کے افراد زندہ رہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کا مدار روٹی پر ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان خود آپ نے ۱۹۵۹ء میں مری کی کمشنرز کانفرنس میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ

> انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی کبھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

روٹی کے مسئلہ" کے حل کے سلسلہ میں، مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کے معاشی مسلک میں جو کشمکش جاری ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے ٹنڈو الہ یار کے اپنے خطاب میں فرمایا تھا۔

> آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہمی کشمکش آئیڈیالوجی پر

مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کرے۔ مغرب، کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ ہمکی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے، لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے۔ اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کے فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کشمکش میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی بن سکتا ہے جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔

لو سیب۔ کمیونزم کے باطل فلسفہ اور مغرب کے انسانیت سوز سرمایہ دارانہ نظام کی کشمکش میں، اسلام ہی وہ آئیڈیالوجی پیش کرتا ہے جس پر قائم کردہ معاشی نظام انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ ایک طرف تو یہ اعلان کرتے ہیں کہ مغرب، کمیونزم کا کوئی مؤثر جواب نہیں پیش کر سکا، اور دوسری طرف خود اپنے ہاں مغرب کا معاشی نظام رائج کئے ہوئے ہیں اور اسی نظام سے کمیونزم کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغرب کی آئیڈیالوجی جس مادہ پرستی کی مظہر ہے اس کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہوتی ہے کہ

انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ صرف مفاد خویش کی کشش ہے۔

اس عقیدہ کا فطری نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو اپنی ہستی کے جواز میں دلیل ہی یہ پیش کرتا ہے کہ اگر افراد کو ان کی کوششوں کے ماحصل کا مالک قرار نہ دیا جائے تو وہ کبھی جی بھر کر محنت نہیں کریں گے۔ اور بدقسمتی یہ کہ خود ہمارے ہاں کا مذہبی طبقہ اس فلسفہ اور نظام کو عین اسلامی قرار دیتا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایک طرف ہماری حالت یہ ہے کہ جب ہم تاریخ انسانیت کی بلند ہستیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے مفاد خویش سے بلند ہو کر مفاد انسانیت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اور اس کے لئے وہ دن رات محنت کرتے اور مشقتیں اٹھاتے تھے۔ اور دوسری طرف ہم اس عقیدہ کو "فطرت انسانی" کا تقاضا (اور اسلام کے عین مطابق) قرار دیتے ہیں کہ انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ صرف مفاد خویش کی کشش ہے۔ کہا جائے گا کہ جن بلند ہستیوں کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ عام انسانوں کی "فطرت" ایسی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ دلیل بالبداہت باطل ہے۔ قرآن ایک ایسا

فلسفۂ زندگی اور نظام حیات پیش کرتا ہے جس پر کاربند ہونے سے عام انسان، ان خصوصیات کے مالک بن جاتے ہیں جنہیں ہم مستثنیات کی صفات قرار دیتے ہیں۔ غلط نظام میں اس قسم کی خصوصیات کے حامل افراد کا شمار واقعی مستثنیات میں ہوتا ہے۔ لیکن قرآنی نظام میں یہی استثناء عمومیت بن جاتا ہے۔

> لہذا، مغرب کی مادہ پرستی اور کمیونزم کی انسانیت سوزی کا ایک ہی علاج اور جواب ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے ہاں قرآن کا معاشی نظام عملاً رائج کر دیں۔

آپ نے خود بھی یہی علاج بتایا تھا جب (ننڈوالہ یار کے خطبہ میں) فرمایا تھا کہ:-

> کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیا لوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی۔ سیاسی۔ معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

یہی وہ نظام ہے جو ایک طرف، انسان کو مفاد خویش کی تنگنائے سے نکال کر، مفاد انسانیت کی وسیع فضاؤں میں اڑنے کی قوت عطا کر دیتا ہے اور دوسری طرف مملکت کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی اس بنیادی ذمہ داری سے بطریق احسن سبکدوش ہو سکے جس کی رو سے

> اس مملکت کی حدود میں بسنے والا کوئی متنفس اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔

واضح رہے کہ قرآنی نظام میں یہ مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر متنفس کو بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ہر فرد انہیں بطور اپنے حق کے مملکت سے طلب کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے ملت کے اجتماعی کنٹرول میں رہیں۔ اس نظام کی مخالفت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دار طبقہ دونوں کی طرف سے ہوگی۔ اول الذکر اسے کمیونزم قرار دے کر الحاد اور بے دینی بتائے گا اور ثانی الذکر اسے بنیادی حقوق میں دست اندازی سے تعبیر کرے گا۔ لیکن یہ نہ تو کمیونزم ہے اور نہ ہی انسانیت کے بنیادی حقوق میں دست اندازی۔ یہ اس قرآن کریم کا نظام ہے جو انسانیت کے بنیادی حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ اس سے

انسانیت کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی ہوتی ہے نہ کہ ان کا سلب و نہب۔ (یہ نظام کس طرح کمیونزم کے جعلی نظام کی ضد اور اسلام کا تقاضا ہے، اس کی وضاحت ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں)۔ باقی رہا مخالفت کا سوال، سو وہ کونسی بنیادی تبدیلی ہے جو مخالفت کے بغیر عمل میں آسکتی ہے؟ اسی لئے تو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے جرأتِ رندانہ

آپ نے اپنے انتخابی منشور میں کہا تھا کہ آپ کے پیشِ نظر حسب ذیل مقاصد ہیں۔

(۱) طبقاتی تقسیم کا مٹانا۔
(۲) دولت کی عادلانہ تقسیم۔
(۳) غریب اور امیر کی تفریق ختم کرنا۔
(۴) اشیائے ضروریہ کی اتنی قیمتیں مقرر کرنا کہ وہ ہر ایک کی دسترس کے اندر ہوں۔
(۵) ہر ایک خاندان کے لئے سکونتی مکان مہیا کرنا۔
(۶) ملک سے رشوت ستانی اور بدعنوانی کا ختم کرنا۔

یہ تمام مقاصد قرآن کے معاشی نظام کی رو سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے سوا ان کے حصول کی کوئی اور شکل نہیں

صدرِ محترم! یہ ہیں وہ چند گزارشات جنہیں ہم بسر و چشم آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں یہ صرف ہماری استدعا ہی نہیں، ملک کے کروڑوں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز ہے جسے ہم آپ کے گوش گزار کرنا اپنا انسانی اور ملی فریضہ سمجھتے ہیں۔

راعیٔ ملت! صدرِ مملکت کا منصب، بزرگ خاندان کا سا ہوتا ہے جسے اپنی مملکت (یعنی گھر کے اندر احتیاط اس لئے حاصل ہوتے ہیں کہ وہ ہر فردِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ عدل و انصاف کے مطابق کرے۔ ہر ایک کی کمی کو پورا کرے۔ گھر کا نظم و نسق درست رکھے۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرے کہ وہ دنیا میں شریف زادے کہلائیں اور انسانوں کی صف میں ممتاز حیثیت حاصل کریں۔ جو باپ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے، بچے اس کا دل سے احترام کرتے ہیں اور باہر والوں کی نگاہوں میں بھی اسے عزت حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوموں کی زمام اقتدار آتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے متعلق کہتا ہے کہ

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ

كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے تمہارے پیش روؤں کے بعد، ملک کی حکومت تمہیں دی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

آپ نے اس سے دیکھ لیا ہوگا کہ آپ کو حالیہ انتخاب میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے آپ پر کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہو گئی ہے — ایسی عظیم ذمہ داری جس کے احساس سے حضرت عمرؓ جیسے خلیفۂ راشد نے، اپنی زندگی کے آخری لمحات میں، باچشم نم کہا تھا کہ اے کاش! میں امیر المومنین ہونے کے بجائے، گھاس کا تنکا ہوتا تاکہ ان ذمہ داریوں کی باز پرس سے بچ جاتا۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کسی فرد کو کام کرنے کا موقع مل جانا، اس کی بڑی خوش بختی ہوتی ہے۔ ورنہ اکثر لوگوں کی کیفیت وہ ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ..... (۲۳/۹۹)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آجاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! تو مجھے ایک بار پھر وہیں بھیج دے جہاں سے میں آرہا ہوں تاکہ میں اچھے کام کرسکوں — جواب ملے گا کہ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ (وقت کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں مڑا کرتا)۔

آپ اس موقعہ کو غنیمت جانئے اور اس مقصد کو پورا کر جائیے جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا اور جسے ہم آج تک صرف دہراتے چلے آرہے ہیں — یعنی مملکت میں قرآنی نظام کا قیام — (جیسا کہ ہم نے عسکری انقلاب کے بعد لکھا تھا) اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہوگیا تو یقین مانئے، آپ کا نام جریدۂ عالم پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخ انسانیت، آپ کو اقوام عالم میں بلند ترین مقام عطا کرے گی۔ اور جب آپ بحضورِ داورِ دادار جائیں گے تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گا کہ

یہ ہے وہ مردِ بلند ہمت جس کی قوت بازو سے زمانے
میں میرا سکہ رواں ہوا۔

کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جس کا انجام ایسا ہو۔ خدا کرے کہ یہ خوش نصیبی آپ کے حصہ میں آئے اور آپ دنیا سے جاتے وقت آسمان سے بصد فخر و مباہات کہہ سکیں کہ

دیدۂ آغازم ـــــ انجامم نگر

والسلام بصد احترام

خیر اندیش

ادارۂ طلوع اسلام

لاہور

طلوع اسلام کا آئندہ شمارہ

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں

طلوع اسلام کا آئندہ شمارہ حسب ترتیب یکم مارچ کو شائع ہوگا۔ دسمبر ۶۴ء اور جنوری ۶۵ء کے مشترکہ شمارے (کنونشن نمبر) کے بعد زیر نظر شمارے کی تاریخ اشاعت دراصل یکم فروری تھی۔ لیکن قارئین کے دو ماہ کے طویل انتظار کا لحاظ کرتے ہوئے اسے قبل از وقت شائع کیا جا رہا ہے۔

(ناظم ادارہ)

حقائق و عِبَر

۱۔ سیاسی بہروپیے

بھارت کے مہامنتری (وزیر اعظم) مسٹر لال بہادر شاستری نے اگلے دنوں بنارس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوش حالی کا ہے جو قوم کے باپو مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدم تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے جب ہم پوری دنیا میں امن و صلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔
>
> (مدینہ۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء)

یہ ساری دنیا میں امن و صلح اور عدم تشدد کی تبلیغ کرنے والے وہ ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے ہاں لاکھوں کی تعداد میں فوج کھڑی کر رکھی ہے بلکہ امریکہ، برطانیہ، روس، غرضیکہ ساری دنیا سے انبار در انبار سامانِ جنگ اکٹھا کئے چلے جا رہے ہیں۔ یہی کچھ جواہر لعل نہرو کہا کرتے تھے اور یہی ویاکھیان (وعظ) اب ان کے جانشین دہرا رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی نہرو یا شاستری کی افتادِ طبیعت کا نتیجہ نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس سیاست کا جس کی داغ بیل ان کے سیاسی گرو، چانکیہ نے "کام شاستر" میں ڈالی اور جسے گاندھی نے عملی جامہ پہنایا۔ اس سیاست کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم دنیا کو وہ کچھ بن کر دکھاؤ جو کچھ تم درحقیقت نہیں ہو۔ اصل یہ ہے کہ سیاست جب بھی مہاتمائیت کا بہروپ دھار لے ـــ یعنی جب الدجال شیطان، خدا کا نقاب اوڑھ کر سامنے آئے، خواہ اس کا نام رام راج رکھا جائے یا تھیاکریسی ـــ وہاں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔

۲۔ نوجوان طبقہ مذہب سے بھاگ کیوں رہا ہے؟

پہلے اسے پڑھ لیجئے

آج سے نصف صدی پیشتر چھوٹے مواضعات میں روٹی پکانے کے لئے توے بالعموم مٹی کے بنے ہوتے تھے لوہے کے توے کا رواج اس کے بعد زیادہ ہوا ہے۔ یہ واقعہ بھی مٹی کے توے سے متعلق ہے۔ کسی گھر میں ایسا ہی ایک توا تھا اور اس پر روزانہ روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ مگر توے کے درمیانی حصہ پر ایک پیسہ کے برابر روٹی بالکل کچی رہ جایا کرتی تھی اور گھر والے اتنا ہی حصہ چھوڑ کر باقی روٹی کھا لیا کرتے تھے۔ یونہی یہ سلسلہ مدت تک چلتا رہا۔ زمانہ تھا سیدھا سادہ، آج کل تو لکھا پڑھا طبقہ خصوصاً حکام فکرِ معاش میں ہلکان ہوئے جا رہے ہیں لیکن اس زمانہ میں ایسا نہیں تھا۔ ورنہ وہ ایسے توے کو باقی رکھنا کب گوارا کر سکتے تھے جس میں ہر روٹی پکانے میں کم از کم چھیا ماشہ آٹا برباد جائے۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ لہٰذا ایسے توے کو برداشت کئے جا رہے تھے۔ ایک روز نہ معلوم کس حادثہ کے تحت وہ توا ٹوٹ گیا۔ اور عین درمیان سے ٹوٹا۔ یعنی اس مقام سے جہاں سے روٹی خام رہتی تھی اور اس پر آگ اثر نہیں کیا کرتی تھی۔ تب یہ دیکھ کر دیکھنے والے فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے کہ اس خلاء میں سے جو اس مٹی کے توے کے اندر تھا ایک ننھا سا کیڑا برآمد ہوا اور اس شان سے کہ اس کے منہ میں چاول کا ایک دانہ بھی تھا۔ سبحان اللہ دیکھئے! سبحان اللہ العظیم۔ اللہ تعالیٰ کو اس ننھی سی جان کو بچانا تھا کہ اس پر آگ کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر اس حالت میں جہاں کوئی سوراخ نہیں اسے اس کی روزی خالق و رزاق ہمیشہ اس طریقہ سے پہنچاتا رہا کہ انسانی عقل اس میں کسی طرح کام نہیں دیتی۔

علاوہ ازیں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ جب وہ توا خام مٹی سے تیار کیا گیا اسی وقت یہ کیڑا اس مٹی میں بند ہو گیا پھر جب برتن پکانے والی بھٹی میں صدہا من آگ میں رکھا گیا اس وقت بھی اس آگ سے اسے اللہ نے بچایا۔ بہرحال یہ اللہ کی قدرت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اپنی روزی کمانے کے سلسلے میں خواہ مخواہ ہلکان ہوئے رہتا ہے حالانکہ اس کا ذمہ خالق و رزاق نے خود لے رکھا ہے۔

بنا والاں آں چناں روزی رساند   کہ دانا اندریں حیراں بماند

پڑھ لیا آپ نے! اب یہ سن لیجئے کہ یہ مضمون کسی "دقیانوسی" کتاب یا رسالہ میں نہیں چھپا۔ یہ شائع ہوا ہے اُس جماعت اسلامی کے مؤید ہفت روزہ شہاب (کی ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کی اشاعت) میں جس کا دعوےٰ یہ ہے کہ وہ دین کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد جب کوئی تعلیم یافتہ نوجوان اس قسم کے مذہب سے رسمی تڑاکر بھاگے گا تو یہ حضرات اُسے کوسنے لگیں گے اور کبھی اس پر غور نہیں کریں گے کہ ــــ آمے باد صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست۔

پھر ذرا اس امر کو بھی سامنے لائیے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ عظیم معجزہ بیان کیا جاتا ہے کہ نمرود نے انہیں آگ میں ڈال دیا لیکن وہ اس سے صحیح و سلامت نکل آئے۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ یہ واقعہ تو صرف ایک مرتبہ ہوا لیکن اس کپڑے کے ساتھ یہ ہوا کہ پہلے اس توے کو پکانے کے لئے "صدہا من آگ میں رکھا گیا"۔ اُسوقت بھی وہ اس آگ سے محفوظ رہا۔ پھر برسوں تک صبح شام اسے روٹی پکاتے وقت "آگ پر تپایا جاتا رہا۔ وہ برسوں تک اس آگ سے بھی محفوظ رہا۔ محفوظ ہی نہیں رہا بلکہ اسے تازہ بتازہ رزق بھی ملتا رہا۔ اب اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ حضرت! اسے کس کا معجزہ سمجھا جائے تو یہ اُس سوال کرنے والے کو ملحد اور مُرتد قرار دے دیں گے۔ اور اپنی حکومت قائم ہونے پر اُسے پھانسی پر چڑھا دیں گے۔

یہ ہے اُس دینی تعلیم کا نمونہ جو آجکل ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔

۳۔ یہ کس قسم کا "خدا" ہے!

معاصر نوائے وقت کی ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں "صدارتی انتخاب" کے نتیجہ کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"انتخاب میں ہار جیت خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

اور اسی اشاعت کے صفحہ اول پر نمایاں طور پر کہا گیا ہے کہ: "انتخاب کے سلسلہ میں بیحد بے قاعدگیاں اور دھاندلیاں ہوئیں۔ تمام غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ ہر قسم کا دباؤ ڈالا گیا۔ وغیرہ وغیرہ"

ظاہر ہے کہ جب انتخاب میں ہار جیت خدا کے ہاتھ میں تھی تو صدر محمد ایوب خاں کی کامیابی خدا کی طرف سے تھی۔ اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کامیابی کے لئے جو غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ جو بے قاعدگیاں اور دھاندلیاں ظہور میں آئیں۔ کیا وہ بھی خدا ہی کی طرف سے تھیں!

اگر وہ (معاذ اللہ) خدا کی طرف سے تھیں، تو ایسے "خدا" کو کیا کہئے؟

اور اگر وہ خدا کی طرف سے نہیں تھیں تو ایسے "خدا" کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے جو ایسے شخص کو کامیاب کرا دیتا ہے جو اس قسم کے غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک روش چلی آرہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی معاملہ میں ناکام رہ جاتا ہے تو وہ اپنی ناکامی کو خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اس سے نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو اس ناکامی کی ذمہ داری سے سبکدوش کر کے انسان فریب آمیز سکون حاصل کر لیتا ہے۔ حالانکہ خدا کا ارشاد یہ ہے کہ جو خرابی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو سامنے رکھے تو ظاہر ہے کہ وہ پھر اس ناکامی کے علل و اسباب پر غور کرے گا۔ اور آئندہ کے لئے ان کے ازالہ کی فکر اور کوشش کرے گا۔

لیکن یہ ہمارے ملی صحائف عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں۔ یہ ایک ہی سانس میں اپنی ناکامی کو منجانب اللہ بھی قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان غیر اخلاقی ہتھکنڈوں کو بھی گنا نا شروع کر دیتے ہیں جن کے بل بوتے پر (ان کے خیال کے مطابق) فریق مخالف کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور ایسا کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ اس سے خدا کے متعلق ذہنوں میں کس قسم کے خدا کا تصور پیدا ہوتا ہے!

۴۔ ایسے کے متعلق آپ کیا کہیں گے!

ہفت روزہ معاصر شہاب کی ۲۷ دسمبر کی اشاعت میں محترم نعیم صدیقی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کسی کے اس مشورہ کا جواب دیتے ہوئے کہ — جماعت اسلامی کو چاہیئے کہ وہ تبلیغ کا کام کیا کرے اور سیاست سے تعرض نہ کرے۔ یہ بتایا ہے کہ دین اور سیاست کی یہ ثنویت، اسلام کے خلاف ہے اور اس کی شہادت میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے ارشادات پیش کئے ہیں۔ "قائداعظمؒ کے فرمودات اُن کی اُن تقاریر پر مشتمل ہیں جو انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران مختلف مقامات پر کی تھیں۔ مثلاً

> مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں انہیں خود اپنے ضابطۂ حیات اپنے تہذیبی ارتقاء، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کرنی ہے۔

صدیقی صاحب نے ایک اور اقتباس دیا ہے جس میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا۔

> لیگ ہندوستان کے اُن حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ نے واضح کر دیا تھا کہ تحریک پاکستان سے مقصد یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی مملکت حاصل ہو جائے جس میں ہم اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں۔

لیکن عین اس زمانے میں جب قائداعظمؒ کی طرف سے اس قسم کے اعلانات ہوتے تھے، مودودی صاحب یہ لکھتے تھے کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک
یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۶۵ھ ص ۲۷)

ہم محترم نعیم صدیقی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کی یہ کیفیت ہو کہ وہ قائداعظمؒ کے ان واضح ارشادات کی موجودگی میں (جنہیں خود صدیقی صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں بطور شہادت پیش کیا ہے) لوگوں کو یہ کہہ کر دھوکا دے کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے اپنی کسی تقریر میں یہ واضح نہیں کیا کہ لیگ کا مقصد اسلامی نظام حکومت کا قیام ہے اس شخص کی دیانت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم محترم صدیقی صاحب کے جواب کے بیتابی سے منتظر رہیں گے۔

۵۔ اب اور جب

اب :- "کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عوام کی اکثریت کے فیصلے کو احمقانہ اور محض اپنی رائے کو عاقلانہ سمجھے۔ کوئی قوم اپنی دشمن نہیں ہوتی کہ وہ اپنی قبر اپنے ہاتھ سے کھودے۔ اور اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو بھی تو آخر ایک شخص اسے کب تک قبر میں جانے سے بچا سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس طرح کی باتوں کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ آئیے۔ ہم سب عوام کا فیصلہ ماننے کے لئے تیار ہو جائیں۔ انتخابی مقابلے کو انصاف اور معقولیت کے ساتھ اس کے فطری نتائج تک پہنچنے کا موقع دیجئے اور قوم کا فیصلہ عالی ظرفی کے ساتھ قبول کر لیجئے" (سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریر جو ۱۰ر نومبر کو کراچی کی پریس کانفرنس میں کی گئی۔ بحوالہ آئین لاہور مورخہ ۱۱/۱۱/۶۴ء)

جب : یعنی تحریک پاکستان کے زمانے میں جب اکثریت قائداعظمؒ کے ساتھ تھی۔

"یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔"

(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ ص ۲۷)

۶۔ پارٹی بازی کی لعنت

پارٹی بازی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اس میں متعلقہ پارٹی کے ممبر کو دین و دانش، عقل و فکر ضمیر اور عقیدہ۔ دیانت و امانت سب کو بالائے طاق رکھ کر پارٹی کے فیصلے کے پیچھے لگنا پڑتا ہے۔ اس کی تازہ شہادت، جماعت اسلامی کا تازہ ترین کردار ہے۔ عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں مودودی صاحب نے جو کچھ اس سے پہلے کہا، جماعت کے اراکین نے اس پر بھی بلا چوں وچرا آمنا و صدقنا کہا۔ اور اب جب انہوں نے اپنے اس پہلے موقف کے یکسر خلاف دوسرا فیصلہ دے دیا تو اس پر بھی پارٹی کے ممبروں نے آمنا و صدقنا کہہ دیا۔ اس پر صرف آمنا و صدقنا ہی نہیں کہا بلکہ جیسا کہ پارٹی بازی کا تقاضا ہوتا ہے، اس نئے فیصلے کے حق میں بھی اسی طرح لکھنے اور بولنے چلے گئے جس طرح اس پہلے فیصلہ کی تائید میں لکھتے اور بولتے رہے تھے۔ اس نئے فیصلہ کی تائید کے وقت، انکی دیانت کا یہ عالم رہا کہ نہ مودودی صاحب نے کسی جگہ اپنی سابقہ تحریروں کو پیش کر کے اپنے تبدیل شدہ مسلک کے جواز میں کچھ کہا۔ نہ ان کی پارٹی کے ممبروں میں سے کسی نے ایسا کیا۔ ان سب نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں تاثر یہ پیش کیا گویا مودودی صاحب نے پہلے یہ کہا تھا کہ عام حالات میں تو عورت سربراہ نہیں ہو سکتی لیکن خاص حالات میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ وہ خاص حالات اب پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ہم محترمہ مس فاطمہ جناح کی تائید کرتے ہیں۔ اگر وہ مودودی صاحب کی سابقہ تحریروں کو پیش کرتے تو ان سے خصوصی حالات اور اضطراری کیفیت کی گنجائش قطعاً نہیں نکل سکتی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسلام کے اصول ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے۔ خدا نے عورت کو اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کیا۔ اگر اسے سیاست کے میدان میں گھسیٹ لایا جائے تو وہ نہ عورت رہ سکتی ہے نہ مرد بن سکتی ہے۔ ان تحریروں کو ان میں سے کسی نے پیش نہیں کیا ـــــ نہ خود مودودی صاحب نے نہ ان کے حواریوں میں سے کسی نے ـــــ حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ مودودی صاحب اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں اور اب کس طرح اس کے خلاف جا رہے ہیں۔

یہ ہے پارٹی بازی کی لعنت۔ اور یہ حشر ہوتا ہے پارٹی بازی میں دیانت اور ضمیر کا۔ اور جب اسے اسلام کہہ کر پیش کیا جائے تو پھر آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ ان لوگوں کا اسلام سے مفہوم کیا ہے!

۷۔ تحریف کی انتہا

مذہب عیسائیت کی ساری عمارت حضرت مسیح کے صلیب کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے۔ اور اس عقیدہ کے ساتھ کہ یہ صلیب یہودیوں کی سازش سے دی گئی تھی اور وہی اس کے ذمہ دار تھے۔ خود یہودیوں کو اس کا اعتراف ہے۔

بلکہ وہ اپنے اس کارنامہ کو فخریہ پیش کرتے ہیں۔ عیسائیوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ان کی مذہبی کتابیں اس تفصیل سے بھری پڑی ہیں کہ اس باب میں یہودیوں نے کیا کچھ کیا اور کس طرح ان کے خداوند خدا " کو سولی پر چڑھا کر، بزعم خویش (معاذ اللہ) لعنتی موت مارا۔ دو ہزار سال سے یہ واقعہ بطور ایک مسلّمہ حقیقت کے مسلسل بیان ہوتا چلا آرہا ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی اس بات میں اختلاف تو ایک طرف شبہ تک نہیں کیا کہ اس کے ذمہ دار یہودی نہیں تھے۔ لیکن ایک دو سال اُدھر جب عیسائیوں کو اسرائیلی حکومت کی دوستی مطلوب ہوئی تو اس باب میں کچھ کھسر پھسر شروع ہوئی۔ صلیب (حضرت مسیحؑ کے متعلق (ایک ناول پر مبنی) ایک سینما کی فلم — بن حر نام سے — مدت ہوئی پردہ سیمیں پر آئی تھی جس میں کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی اس سازش کو خوب بے نقاب کیا گیا تھا۔ پچھلے سال اسی فلم کا ایک تازہ ایڈیشن ساری دنیا میں گھمایا گیا۔ اس میں ترمیم یہ کی گئی کہ اس حادثہ عظیم کے ذمہ دار یہودی نہیں بلکہ رومی تھے۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ اتنی بڑی تبدیلی کیوں؟ لیکن اسے محض ایک فلم — لہٰذا کھیل تماشہ۔ سمجھ کر زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ اب پچھلے دنوں کیتھولک کلیسا کی طرف سے وہ کلیسا جو اپنے عقائد اور مسلّمات میں بڑا قدامت پرست اور متشدد واقع ہوا ہے — جناب پوپ کی تائید سے یہ نیا عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی صلیب کے ذمہ دار یہودی نہیں تھے۔ اس بنیادی تبدیلی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بائبل اور عیسائیت سے متعلق دیگر مذہبی لٹریچر کی آئندہ ایڈیشنوں میں نمایاں تبدیلی کی جائیگی۔ دو ہزار سال سے متواتر آنے والی تاریخ کو بدلا جائیگا۔ اور معلوم نہیں اسکے علاوہ اور کہاں کہاں اور کیا کیا تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ یہ سب کچھ خاموشی سے ہو جائیگا اور آنے والی نسلوں کے سامنے ایک نئی "آسمانی کتاب" اور نئی تاریخ آجائیگی جس میں یہ مسلمہ طور پر ثابت کیا جائیگا کہ تصلیب حضرت مسیحؑ کے ذمہ دار یہودی نہیں تھے۔ قرآن کریم کے علاوہ دیگر مبینہ آسمانی کتابوں کو غیر محرف سمجھنے والے ذرا اس واقعہ پر غور کریں اور سوچیں کہ جن لوگوں کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ایک ذرا سی وقتی سیاسی مصلحت کی خاطر اتنی بڑی تبدیلی کا یوں فیصلہ کرلیں ان کی مرتب اور پیش کردہ کتابوں کی اصلیت کیا ہو سکتی ہے؟ اور یقینیات کے مقابلہ میں تاریخ جیسی ظنّی چیز کو ترجیح دینے والے غور کریں کہ تاریخ کس طرح سیاسی مصالح کے تابع رکھی جاتی ہے۔ تاریخ کسی قوم کی ہو، وہ سیاسی مصالح سے غیر متاثر نہیں رہ سکتی — یاد رکھئے۔ اس آسمان کے نیچے، غیر محرف۔ حقیقی۔ یقینی صحیفہ صرف قرآن کریم ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور جس کا ایک ایک حرف اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ اور ہم اپنے اس دعوے کو دنیا کے سامنے علیٰ وجہ البصیرت پیش کر سکتے ہیں

دین۔ مذہب۔ روحانیت

موقر جریدہ الاعتصام (لاہور) " مسلک اہلحدیث کا داعی اور جماعت اہلحدیث کا ترجمان " ہے۔ عوام الناس! اہل حدیث حضرات کو " وہابی " کہتے ہیں اور وہابیوں کے متعلق مشہور ہے (بلکہ یہ ان کی امتیازی خصوصیت بتائی جاتی ہے) کہ ان

کے ہاں پیری۔ مریدی نہیں ہوتی۔ پیری۔ مریدی بریلوی فرقے میں ہوتی ہے۔ لیکن الاعتصام کی یکم جنوری کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> پیر کی حیثیت ایک روحانی اور دینی رہنما اور پیشوا کی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی ذہنی تربیت کرتا ہے۔ ان کو دین سکھاتا اور روحانیت کا درس دیتا ہے ..... وہ کوشاں ہوتا ہے کہ اس کی مجلس میں بیٹھنے والوں۔ اس سے بیعت کرنے والوں اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والوں کے قلوب اللہ کی طرف لگ جائیں اور وہ تمام امورِ دنیا سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہو جائیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ حضرات بھی پیر پکڑنے۔ بیعت کرنے۔ اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے قائل ہیں۔ نیز "امورِ دنیا سے بے نیاز و بے پرواہ ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہو جانے" کو اسلامی تعلیم کا مقصود قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد الاعتصام لکھتا ہے۔

> "تاریخ اسلام میں اس قسم کے بلند مرتبت اور رفیع المنزلت دینی رہنماؤں۔ مذہبی پیشواؤں اور روحانی پیروں کی کمی نہیں جن کا سرمایہ حیات ہی کلمۂ حق بلند کرنا۔ نیکی و خیر کی تبلیغ۔ اور دین و مذہب کی ترویج و اشاعت تھا۔

ہم سمجھنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ جو انہوں نے (۱) دینی رہنماؤں۔ (۲) مذہبی پیشواؤں اور (۳) روحانی پیروں کی تین الگ الگ جماعتیں بتائی ہیں کیا ان کی سند کتاب و سنت میں بھی کہیں ملتی ہے؟ کیا دینی رہنما۔ مذہبی پیشوا نہیں ہوتے۔ اور کیا روحانی پیروں کا ان سے کوئی الگ طبقہ ہوتا ہے؟ کیا نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کے زمانے میں بھی اس قسم کی تفریق موجود تھی؟

نیز آپ نے جو لکھا ہے کہ ان لوگوں کا سرمایہ حیات "دین و مذہب" کی ترویج و اشاعت تھا۔ تو کیا دین اور مذہب الگ الگ چیزیں ہیں؟ دین کا لفظ تو قرآن میں آیا ہے۔ کیا مذہب کا لفظ بھی کتاب اللہ میں کہیں آیا ہے؟

ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے مترادفات استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو بھی انہی معانی میں سمجھا جائے۔ لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہوگا۔ جب ہم (مثلاً) "حسن و زیبائی" کہیں گے تو اس سے دو الگ الگ چیزیں ذہن میں نہیں آئیں گی۔ لیکن جب ہم دین اور مذہب کہیں گے تو ان سے دو الگ الگ چیزوں کا تصور سامنے آئے گا۔ لہٰذا وہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہے گا کہ اگر دینی رہنما۔ مذہبی پیشوا۔ اور روحانی پیر۔ یا دین و مذہب ایک ہی چیزیں ہیں تو ان کے لئے الگ الگ اصطلاحات کیوں استعمال کی گئی ہیں۔ اور اگر یہ الگ الگ چیزیں ہیں تو ان میں فرق کیا ہے اور اس تفریق کی سند کیا؟

مفہوم القرآن کا بیسواں پارہ بھی شائع ہوگیا ہے۔ جن پیشگی خریداروں اور دیگر احباب کو درکار ہو، مطلع فرمائیں۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟

مومن کسے کہتے ہیں

محترم پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوع اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۶۴ء

کے کھلے اجلاس سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مومن کسے کہتے ہیں؟

قرآن کریم کی تعلیم انسان کو کیا بنا دیتی ہے، اس کی تفصیل میں جائیے تو کئی مجلدات درکار ہوں گی لیکن اگر اسے اجمالی طور پر بیان کرنا چاہیں تو اس سے بہتر، جامع اور حسین انداز میں کچھ اور نہیں کہا جا سکتا جسے علامہ اقبال نے اس ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے۔ یعنی جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے، وہ مقصد پورا ہو جائے۔ اس کے سفرِ حیات کے لئے، اس صفحۂ ارض پر جو منزل مقرر کی گئی ہے، یہ اس منزلِ منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ انسان اور دیگر حیوانات کی تخلیق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دیکھئے ہر حیوان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ

انسان اور حیوان میں فرق

از خود وہ کچھ بن جاتا ہے۔ اس کے لئے اسے نہ کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ سعی و کاوش کی حاجت۔ فطرت نے اس کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات رکھے ہیں، وہ امکانات از خود بتدریج مشہود ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک عمر تک پہنچ کر وہ حیوانی بچہ، اپنی نوع کا مکمل فرد بن جاتا ہے ـــــ شیر کا بچہ شیر بن جاتا ہے۔ بکری کا بچہ بکری۔ لیکن انسانی بچے میں فطرت نے جو مضمر صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیوانی یا طبیعی صلاحیتیں۔ یہ دیگر حیوانات کی طرح از خود نشو و نما پا کر ایک منتہیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور وہ بچہ بالآخر آدمی بن جاتا ہے۔ دوسری صلاحیتیں انسانی ہیں۔ یہ از خود نشو و نما نہیں پاتیں۔ انہیں مناسب تعلیم و تربیت سے نشو و نما دے کر اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس سے ہر فرد کی وہ مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشو و نما پا کر مشہود ہو جاتی ہیں اور پھر وہ انہیں ان مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے جو اس کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچ جائے گا تو کہا جائے گا کہ انسان وہ کچھ بن گیا جو کچھ بننا

مومن

اس کے لئے مقصود و مطلوب تھا۔ قرآن نے ایسے فرد کو مردِ مومن کہہ کر پکارا ہے اور انسان کی اس ہیئت کو احسن تقویم قرار دیا ہے (۹۵:۴)۔ یعنی ایسی ہیئت جو حسن و توازن میں انتہا تک پہنچ گئی ہو۔ جن خصوصیات کے مظہر یہ افراد ہوں انہیں صفاتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ خصوصیات، محسوس شکل میں سامنے آئیں تو انہیں اعمالِ صالحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے کام جو اس فرد کی بھرپور انسانی صلاحیتوں کے اثمار و نتائج ہوں اور جن سے عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو اسے قرآن نے خَیْرَ اُمَّۃٍ (۳:۱۱۰) "بہترین قوم جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے" قرار دیا ہے اور اُمَّۃً وَّسَطًا (۲:۱۴۳) "یعنی ایسی قوم جسے عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو" کا مقام دیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھئے تو معاشرہ، جماعت یا اُمّت، افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے۔ لیکن اجتماعی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ جماعت، افراد کی حاصل جمع (Sum-Total) کا نام نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن، افراد کی خصوصیات کے علاوہ، جماعتِ مومنین کی خصوصیات کا ذکر بھی خاص طور پر

اُمّت کی خصوصیات

کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ افراد کی تعلیم، تربیت اور نشوونما کے علاوہ ان اصول و ضوابط کی بھی وضاحت کرتا ہے جن کے مطابق ان افراد نے اجتماعی امور سرانجام دینے ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ ایک منفرد جماعت بنتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی تعلیم کی انفرادیت اور بے مثالیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور اسی مقام کے سامنے نہ ہونے سے، اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کو بھی یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"[1]۔ "عالمگیر سچائیوں" سے ان کی مراد ہوتی ہے عام اخلاقی اصول ـــ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ دیانت۔ وغیرہ۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہی اخلاقی اصول قرآن پیش کرتا ہے اور یہی تعلیم دنیا کے دیگر مذاہب میں پائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس اجتماعی نظام میں ان اخلاقی

نظام اور فرد

اصولوں کے حامل افراد زندگی بسر کرتے ہیں، اس نظام کے اصول کیا ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک برہمن جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ انسان تو ایک طرف، کیڑوں مکوڑوں تک کو بھی نہیں ستاتا۔ لیکن جس اجتماعی نظام کا وہ فرد ہے اس کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں اس قدر گہرا اور بنیادی فرق ہوتا ہے کہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ساری عمر دوسروں سے اپنی پرستش کراتا ہے اور شودر کے ہاں جنم لینے والا بچہ تمام عمر دوسروں کی خدمت اور چاکری میں بسر کر دیتا ہے۔ اور

---

[1] ترجمان القرآن۔ ابوالکلام آزاد مرحوم۔

یہ فرق اس قدر غیر متبدل ہوتا ہے کہ شودر کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے جوہرِ ذاتی اور اس کی ہزار محنت اور کوشش اس فرق کو مٹا نہیں سکتی۔ آپ کہئے کہ جو معاشرہ اس اجتماعی اصول کے مطابق متشکل ہو، اس میں افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، کیا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں؟ افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" محدود سے انفرادی حلقہ میں قدرے سکون پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن نہ تو یہ انسان کو اس کا صحیح مقام دینے کے قابل بن سکتی ہیں اور نہ ہی عالمگیر انسانیت کی فوز و فلاح کا موجب۔ حتیٰ کہ یہ اُس باطل نظام کو تباہی سے بچا سکنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتیں جس کے اندر وہ "نیک انسان" زندگی بسر کرتا ہے۔ یا مثلاً جس معاشرہ کا اصول یہ ہو کہ جو بچہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ہاں پیدا نہ ہو، وہ نجات و سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس معاشرہ میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، عالمِ انسانیت کے کس کام آ سکتی ہیں؟ یا جس معاشرہ میں عقیدہ یہ ہو کہ ہر انسانی بچہ، پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کے گناہوں کا یہ داغ "خدا کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کے کفارہ پر ایمان سے ہی دھل سکتا ہے۔ اس کے سوا، اس داغ کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں، اس معاشرہ میں لوگوں کا رحمدل۔ حلیم الطبع۔ اور منکسر المزاج ہونا، شرفِ انسانیت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ دنیا کے مذاہب سے الگ ہٹ کر دیکھئے اور

باطل کا نظام اور انفرادی نیکیاں

سوچئے کہ کیا نظام ہائے کیسے ہیں۔ ایک بادشاہ کے لئے جو کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی چلاتا ہے، یہ بات موجبِ فخر قرار پا سکتی ہے کہ اس نے ساری عمر تہجد قضا نہیں کی یا شراب نہیں پی؟ نظام سرمایہ داری میں، اگر ایک جاگیردار۔ زمیندار یا کارخانہ دار، جو ہزاروں محنت کش غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سمیٹ کر لے جاتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اس نے کبھی چوری نہیں کی، تو کیا اُسے نیک انسان کہا جا سکتا ہے؟ اگر ایک مذہبی پیشوا، جو دن رات عوام کو اس قسم کے عقائد کی تعلیم دیتا رہتا ہے کہ امیری اور غریبی انسان کی تقدیر سے وابستہ ہے جسے خود خدا نے مقرر کیا ہے اور خدا کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، یہ کہتا ہے کہ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی یہ انفرادی نیکی، انسانیت کی اجتماعی میزان میں کوئی وزن رکھے گی؟ ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جن انفرادی اخلاقی خوبیوں کو "عالمگیر سچائیاں" کہہ کر اسلام کو مذاہبِ عالم کی صف میں ہم دوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، غلط اجتماعی نظام میں ان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب، انفرادی ضابطۂ اخلاق کا علمبردار ہوتا ہے اجتماعی نظام سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، دین، اجتماعی نظامِ انسانیت کو سامنے رکھتا ہے اور افراد کی اخلاقی خوبیوں کو اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس سے اس معاشرہ کا توازن قائم رہے جو عالمگیر انسانیت کی سلامتی اور ارتقاء کا ضامن ہے، اور یوں انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔

قرآن کی جامع تعلیم

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ

(۱) جس معاشرہ میں افراد عام اخلاقی ضوابط کی پابندی نہیں کرتے، اس معاشرہ میں کسی کو امن اور سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور خود معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

(۲) جس معاشرہ میں افراد عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، لیکن خود معاشرہ غلط اجتماعی اصولوں پر متشکل ہو، اس میں عام معاشرتی روابط میں قدرے سکون حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ تو اس معاشرہ کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں، اور نہ ہی اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجب رحمت بن سکتا ہے۔

(۳) جس معاشرہ میں افراد عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، اور خود معاشرہ بھی صحیح اجتماعی اصولوں کا علمبردار ہو، اس میں، افراد معاشرہ کو حقیقی امن و سکون میسر ہوتا ہے۔ ان کی طبیعی اور انسانی صلاحیتیں نشوونما پاکر برومند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجب فلاح و سعادت ہوتا ہے۔

قرآن کریم اسی قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں افراد معاشرہ عام اخلاقی اصولوں کے شدت کے ساتھ پابند ہوں، اور جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو، وہ ان مستقل اقدار کا حامل ہو جو عالمگیر انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ اور یہ ہے قرآن کا وہ نظام جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ قرآنی تعلیم اپنی اس خصوصیت کبریٰ کی بنا پر بے مثل و منفرد ہے۔ قرآن میں مومنین کی ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر اس تفصیل، کثرت اور تکرار سے آیا ہے کہ اس سے افراد کی سیرت و کردار کا صحیح نقشہ اور جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) کا بین اور واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ اکثر مقامات پر ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر الگ الگ آیا ہے لیکن بعض مقامات پر یہ ایک دوسرے میں یوں سموئی ہوئی سامنے آتی ہیں جیسے ایک حسین و شاداب شجرِ طیب کہ اگر اس کی شاخوں، پتیوں، پھولوں اور شگوفوں کو دیکھا جائے تو پورے کا پورا درخت باعثِ شادابیٔ قلب و نظر ہو جائے اور اگر اس سرسبز و شاداب درخت پر بہیئتِ مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو اس کی تمام پھول پتیوں کی نزہت و نظافت روح نشاط روح بن جائے۔ آئندہ سطور میں ان افراد کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جنہیں قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ ہم ان خصوصیات کی روشنی میں، اپنی سیرت و کردار پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک ان کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح عرقِ گلاب اُسے کہا جائے گا جس میں گلاب کی خوشبو اور خصوصیات ہوں۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو وہ عرقِ گلاب نہیں ہوگا پانی کا پانی ہوگا خواہ اس بوتل پر کیسے ہی خوبصورت لیبل پر سنہرے حروف میں "عرقِ گلاب" کیوں نہ لکھا ہو۔ اسی طرح مومن وہ کہلائے گا جو مومن کی صفات کا حامل ہو۔ یہی وہ معیار ہے، جس پر ہم اپنے مومن ہونے کے دعوے کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور ان صفات کے تذکرہ سے یہی مقصود ہے۔

سب سے پہلے معاشرہ کے روزمرہ کے معاملات اور روابط کو لیجئے اور دیکھئے کہ قرآن کریم ان امور کو بھی کسقدر

تمسخر نہ اڑاؤ

اہمیت دیتا ہے جنہیں عام طور پر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا لیکن جن سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جماعتِ مومنین سے تاکید کرتا ہے کہ

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (۴۹/۱۱)

کوئی جماعت، دوسری جماعت کا تمسخر نہ اڑائے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمسخر، جسے ہمارے ہاں ہنسی (LIGHTLY) لیا جاتا ہے، کتنے بڑے فساد کا موجب بن جاتا ہے۔ تمسخر درحقیقت ایک گہری نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، جو نفرت۔ حسد۔ اور انتقام کے جذبات کی پیداکردہ ہوتی ہے، لیکن ہر شخص میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ان جذبات کا اظہار کھلے بندوں کرے۔ وہ انہیں تمسخر کے فریب کارانہ پردوں میں چھپاکر پیش کرتا ہے۔ تمسخر کے تیز تر شکل وہ ہوتی ہے جسے کسی کا نام رکھنا کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر اس سے بھی روک دیا کہ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ (۴۹/۱۱)۔ ایک دوسرے کے برے برے نام مت رکھا کرو۔

(۲) اس کے بعد ہے

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱)

اور آپس میں ایک دوسرے پر الزام مت لگاؤ۔

الزام تراشی

الزام تراشی کس قدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کی رُو سے زنا کی سزا سو کوڑے ہے اور پاک دامن عورتوں کے خلاف الزام تراشی کی سزا اسی کوڑے۔ ہوتا یہ ہے کہ دوسرے پر الزام لگانے والا، خود تو معتبر بن جاتا ہے اور فریق مقابل کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ اپنی بریت ثابت کرے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو اکثر لوگوں کے دل میں اس شخص کے خلاف بدظنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بھائی! بالآخر کچھ نہ کچھ بات تو ہو گی ہی جس سے یہ الزام لگایا گیا ہے!

تا نباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا

بدظنی سے بچو

قرآن کریم نے ایک طرف الزام تراشی اور بہتان بافی کی اس قدر سخت سزا مقرر کی اور دوسری طرف جماعتِ مومنین سے تاکید کی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹/۱۱)۔

اے جماعت مومنین! بدظنی سے بہت زیادہ بچو۔ یاد رکھو! بعض بدظنی بدترین گناہ تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ خیرسگالی کے جذبات ہونے چاہئیں۔ لیکن جب دل میں کسی کے متعلق بدظنی پیدا ہو جاتی ہے، اس میں خیرسگالی کے جذبات باقی نہیں رہتے۔ اس کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ (۱) ہر شخص کے متعلق تمہارا پہلا ردعمل (First Reaction) نیک ہونا چاہیئے اس کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ (۴/۹۴)۔ جو تمہیں سلام کہے اس کے متعلق، یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ اگرچہ یہ آیت، جنگ کے سلسلہ میں ایک اور اہم اصول کی وضاحت کرتی ہے لیکن جب اس کا اطلاق عام معاشرتی روابط پر کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ تحقیق سے پہلے، تمہارا پہلا ردعمل، ہمیشہ نیک ہونا چاہیئے۔ قرآن کے اسی حکم پر مبنی عدل کا یہ اہم اصول قائم ہوتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے اسے بے گناہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ جب کوئی شخص، تم سے

مومن کا پہلا ردعمل

کسی کے خلاف کوئی بات سے کہے تو تمہارا پہلا ردعمل یہ ہونا چاہیئے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲) یہ صریح جھوٹ ہے۔ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶)۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اپنے اندر (پہلا) ردعمل یہ پیدا کرو، اور پھر اس بات کا چرچا مت کرو (۲۴/۱۹)۔ اگر بات ایسی ہے کہ وہ بالبداہت غلط نظر آتی ہے تو اس کے متعلق خواہ مخواہ کی کرید مت کرو۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲)۔ لیکن اگر

تحقیق کرو

اس کے متعلق کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہے تو اس کی تحقیق کرو۔ اس کے متعلق قرآن نے بڑی تاکید سے حکم دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس معاملہ کی تم خود تحقیق نہ کرو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت۔ بصارت۔ قلب (کان۔ آنکھ اور دل)، ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ آیا تم نے ان سے کام لے کر اس معاملہ کی تحقیق کر لی تھی یا نہیں)۔

اور اگر معاملہ ایسا ہے جس کا اثر جماعتی زندگی پر بھی پڑتا ہے تو اسے متعلقہ حکام تک پہنچاؤ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۳) تاکہ وہ تحقیق کر کے بات کی تہ تک پہنچ جائیں (نیز ۴۹/۶)۔ اسی سلسلہ میں

غیبت مت کرو

قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا (۴۹/۱۲)۔ تم ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔ کسی کی پیٹھ پیچھے اس کے خلاف کوئی بات نہ کرو۔ جو بات کہنی ہو اس کے

سامنے کہو۔ اگر آپ سے کوئی شخص کسی کی غیر حاضری میں اس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو آپ کا فریضہ ہے کہ اس سے کہو کہ چلو! یہ بات اس شخص کے سامنے چل کر کرو۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے آپ کتنے بڑے فساد کا رخنہ بند کر دیتے ہیں۔

اذیّت مت پہنچاؤ

کسی کے خلاف جھوٹے الزام لگانے، یا اس کی غیبت کرنے سے اسے جس قدر قلبی اذیت پہنچ سکتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے لئے قلبی سکون اور مسرت کا موجب ہونے چاہئیں، نہ کہ باعثِ اذیت و کوفت۔ اسی لئے فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (۳۳/۵۸)۔

جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بلا جرم و خطا، ناحق اذیت پہنچاتے ہیں، تو وہ بہتان تراشی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور کھلے ہوئے گناہ کا کام کرتے ہیں۔

اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴/۱۴۸)۔ اللہ اسے بھی پسند نہیں کرتا کہ تم خواہ مخواہ کسی کی بات کی تشہیر کرتے پھرو۔ ہاں مگر جو مظلوم ہو اسے اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ظلم کے مداوا کے لئے داد فریاد کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم روزمرہ کی زندگی سے متعلق ان چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر سے کس طرح ایسی خرابیوں کا سدباب کر دیتا ہے، جو معاشرہ میں بہت بڑے فتنہ اور فساد کا موجب بن جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم، ان (بظاہر) معمولی سی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیں تو معاشرہ میں کس قدر امن اور سکون پیدا ہو جائے! لیکن قرآن، ان چیزوں پر بھی محض میکانکی طور پر عمل نہیں کراتا۔ وہ افراد کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے یہ تمام باتیں ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جماعت مومنین کے جنتی معاشرہ کے متعلق کہا ہے کہ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳)

دل کا شفاف ہونا

ان کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں رہے گی جسے وہ دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہیں۔ آپ غور کیجئے کہ وہ معاشرہ فی الواقعہ کس قدر جنتی ہوگا جس میں افراد معاشرہ کے دل اس قدر آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوں کہ ان میں غبار اور کدورت کا نشان تک نہ ہو اور ہر ایک کا ظاہر و باطن یکساں طور پر سب کے سامنے ہو۔ اسی کو قرآن نے "دلوں میں باہمی الفت پیدا کرنے" سے تعبیر کیا ہے اور جماعتِ مومنین کو جس نعمتِ خداوندی کی یاد دلائی ہے وہ یہی باہمی الفت ہے۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کر کے

کہا گیا۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً۔ تم خدا کی اس نعمت کبریٰ کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ اُلفت اس قسم کے

الفت و اخوت

تعلق کو کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے کے دل یوں باہمدگر مدغم ہو جائیں جس طرح بادل کا ایک ٹکڑہ دوسرے ٹکڑے کے اندر ضم ہو جاتا ہے ۔۔۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگرے ۔۔ اس باہمی الفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ تم اس نوازش خداوندی سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ تم (اس سے پہلے) جہنم کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ بس اس میں گرنے ہی والے تھے کہ خدا نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۳/۱۰۳) اس طرح اللہ اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم جان لو کہ زندگی کا صحیح راستہ کونسا ہے۔ یہ "باہمی اُلفت" ایسی گراں بہا متاع اور نایاب جنس تھی، کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ۔۔ کہ اگر تو چاہتا کہ ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے ان کے دلوں میں ایسی الفت پیدا کر دے، تو بھی یہ ناممکن تھا (۸/۶۳)۔ یہ متاع باہر سے خرید کر دلوں میں داخل نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو دلوں کے اندر تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ ہوتی ہے قرآن کے ساتھ وابستگی کا۔ اسی لئے اسے قائم رکھنے کے لئے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳)۔ خدا کی اس رسّی کو سب مل کر

اعتصام بحبل اللہ

مضبوطی سے تھامے رہو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ یہی وہ رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے کے بعد کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)۔ مومن ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھی ایسے جن کی کیفیت یہ ہے کہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔ آپس میں ایک دوسرے کے بے حد ہمدرد اور غمگسار۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۵/۵۴)۔ ایک دوسرے کے سامنے جھکے ہوئے ۔۔۔ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ۔۔ لیکن اس نرمی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی غلط کام کرے تو اُسے روکا بھی نہ جائے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی

برائی سے روکو

تباہی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵/۷۹) وہ ایک دوسرے کو بُری باتوں سے روکتے نہیں تھے۔ جب جماعت مومنین کا عام فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے (۳/۱۰۴، ۳/۱۱۰؛ [illegible]؛ [illegible]؛ [illegible])۔ یعنی دنیا کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دینا جنہیں قرآن نے اچھا قرار دیا ہے اور ان امور سے روکنا جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ یہ جماعت دوسروں کو تو ایسا کہے گی لیکن خود اپنے معاشرے میں یہ کچھ نہیں کرے گی؟ وہ تو سب سے پہلے ان امور کو خود اپنے ہاں عام کرے گی اور اس کے بعد انہیں دوسروں تک پھیلائے گی۔ اسی لئے جماعت مومنین کی خصوصیت یہ بتائی کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)۔ وہ ایک دوسرے کو حق (قرآنی احکام و قوانین) کے ساتھ تمسک اور استقامت پذیر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح باہمی اصلاح کرتے رہتے ہیں ۔۔۔ اسی لئے کہ وَاَصْلِحُوْا

باہمی صلح کراؤ

ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸/۱)۔ ان کے خدا کا ارشاد ہے اور یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر سوء اتفاق سے ان کی دو جماعتوں میں کہیں لڑائی جھگڑا ہو جائے تو فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (۴۹/۹)۔ ان میں باہمی صلح کراؤ۔ اور اگر ان میں سے کوئی پارٹی سرکشی پر اتر آئے تو اُسے اس سے، بزور روکو۔ اور جب وہ اپنی اس روش سے باز آجائے تو ان دونوں میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو۔

یہیں سے ہمارے سامنے، ایک اور اہم اصول آتا ہے اور وہ ہے توبہ۔ ایک شخص کا عام کردار اچھا ہے۔

توبہ کا مفہوم

لیکن کسی وقت اس سے نادانستہ کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔ اگر اس کی اس غلط حرکت سے کسی کو اذیت یا نقصان پہنچا ہے تو اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے اس کی پوری پوری احتیاط برتتا ہے کہ کبھی اس قسم کی حرکت سرزد نہ ہو۔ اسے قرآن نے تَابَ وَ أَصْلَحَ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس مقام سے نادانستہ غلط قدم اٹھا تھا، اس مقام پر واپس آجانا اور اس کے بعد اپنی ایسی اصلاح کرنا کہ پھر ایسی غلطی نہ ہو۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرکت، نادانستہ۔ غلطی، سہو اور خطا سے سرزد ہوئی ہو۔ عمداً ایسا نہ کیا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ (۴/۱۷)۔ توبہ اسی کی ہے جس سے کوئی غلطی نادانستہ سرزد ہو جائے اور اس کے بعد وہ فوراً اس کی تلافی کر دے۔ اس میں نادانستہ (بِجَهَالَةٍ) اور فوراً (مِن قَرِيبٍ) کے الفاظ غور طلب ہیں۔ یہی چیز قرآن کریم نے دیگر مقامات پر بھی بیان کی ہے (مثلاً ۱۶/۱۱۹ میں)۔

عمداً جرائم

اس کے برعکس، ایک شخص دیدہ دانستہ، عمداً۔ ارادۃً۔ غلط حرکات کا ارتکاب کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ دوسروں کے خلاف جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ غیبت کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور جب وہ کہیں گھر جاتا ہے۔ اپنی مدافعت کی کوئی شکل نہیں دیکھتا، تو کہہ دیتا ہے کہ مجھے معاف کر دو۔ تو اس کا نام توبہ نہیں۔ اس کے دیدہ و دانستہ ارتکاب نے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں اس کے کردار کا جزو بن چکی ہیں۔ یونہی نادانستہ سرزد نہیں ہوئیں۔ اس لئے، جب تک وہ اپنے کردار میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا، ان باتوں سے باز نہیں آسکے گا۔ وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھی ایسا کچھ کرتا رہے گا۔ اسی لئے قرآن نے وضاحت سے کہہ دیا کہ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ (۴/۱۸)۔ توبہ ان لوگوں کی نہیں ہے جو بری حرکات کرتے رہتے ہیں تا آنکہ جب ان کے سامنے موت آکھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں۔ "موت کے سامنے آجانے" سے مفہوم یہ ہے کہ جب اُسے اس کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ بے نقاب ہو جائے گا اور وہ اس کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا تو پھر معافی مانگنے لگ جائے۔

یہ منافقت ہے اور بدترین کردار کی علامت۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس نے کہا کہ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں تو اس سے کہا گیا کہ اب ایمان سے کیا فائدہ؟ یہ بھی واضح ہے کہ ایسے شخص نے اپنی اس قسم کی حرکات سے جس شخص کو اذیت یا نقصان پہنچایا ہے، اگر وہ اسے معاف بھی کر دے تو اس سے اتنا ہی ہوگا کہ اس سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اس کی اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکے گی جب وہ اپنے کردار میں خود تبدیلی پیدا کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مغربی مفکر نطشے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن جو برائی تم نے
> تو اپنی ذات کے خلاف کی ہے، اسے کون معاف کر سکتا ہے؟

اب آگے چلئے۔ مردِ مومن اپنے جوہرِ ذاتی اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بنا پر اپنے اندر وزن رکھتا ہے اور یہ وزن ہر مقام پر اس کا توازن برقرار رکھتا ہے۔ لیکن جب انسان میں یہ خوبیاں نہ ہوں اور اس کا ایگو جھوٹی تسکین چاہے تو اس سے اس کے اندر نخوت اور پندار کے غلط جذبات ابھر آتے ہیں جس سے اس میں چھچھوراپن پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم

چھچھوراپن

مردِ مومن میں یہ چیز پیدا نہیں ہونے دیتی۔ چھچھورے پن کا مظاہرہ انسان کی گفتار، رفتار، چال ڈھال سے ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن اس کی تاکید کرتا ہے کہ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (۳۱/۱۸)۔ زمین پر یونہی اکڑ کر نہ چلو۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ (۳۱/۱۹)۔ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو۔ اسی طرح وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (۳۱/۱۹)۔ اپنی آواز بھی نیچی رکھو۔ چلا چلا کر مت بولو۔ بجا تکبر اور نخوت سے، لوگوں سے ترش روئی سے

نخوت و تکبر

پیش نہ آؤ۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱/۱۸) اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱/۱۸)۔ خدا، خود پسند، شیخی خورے انسان کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مومنین کی نشانی نہیں ہے۔

مومن کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں سے حسد نہیں کرتا۔ (۴/۵۴) بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا ہوں اور اس باب میں وہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا حکم ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ (۲/۱۴۸)۔ بھلائی کی باتوں میں ایک دوسرے سے بڑھ جاؤ۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳/۳)۔ وہ ہر قسم کی لغویات سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر کہیں اتفاق سے اس قسم کی باتیں

حسد نہیں

ان کے سامنے آجائیں تو وہ ان سے دامن بچاتے ہوئے شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵/۷۲)۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰)۔ ہر قسم کے مکر و فریب کی ملمع دار باتوں سے اجتناب کرو۔ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا (۳۳/۷۰)۔ ہمیشہ صاف۔ سیدھی۔ واضح۔ محکم دو ٹوک بات کرو۔ یَقُوْلُ الَّتِیْ

صاف۔ سیدھی بات کرو

هِيَ اَحْسَنُ (۱۷/۵۳)۔ بڑے خوبصورت انداز سے اعتدال کے مطابق ۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح۔ جھوٹ اور سچ کو آپس میں خلط ملط نہ کرو۔ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲)۔ نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

عزۃ الاثم

انسان کے اندر ایک بدترین جذبہ ایسا ہے جو اس کی تمام خوبیوں کو تباہ کر دیتا ہے اور اسے کبھی صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیتا۔ یہ ہے اس کے انیغو کا جذبۂ پندار یعنی (FALSE PRESTIGE) کا احساس۔ اسے قرآن نے عزۃ الاثم کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ایک شخص دل میں محسوس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے لیکن اس کے انیغو کا جذبۂ پندار اسے اس کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ وہ اس کے لئے اعذار بارد (JUSTIFICATORY REASONS) وضع کرتا ہے حالانکہ اس کا دل جانتا ہے کہ یہ دلائل جھوٹے اور یہ وجوہات وضعی ہیں۔ ایسے شخص پر سعادت کی راہیں کبھی نہیں کھل سکتیں۔ یہ چیز پارٹی بازی میں اکثر حق و صداقت کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی پارٹی کا فرد سر تا پا غلطی پر ہو۔ لیکن "پارٹی بازی" کا تقاضا ہے کہ آپ اس کی بہر حال تائید اور مدافعت کریں۔ ایک ڈاکو ہر روز مسافروں کے گلے کاٹے اور غریبوں کو لوٹے اس کی پارٹی کے دوسرے ڈاکو اسے کبھی برا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر وہ لوٹ کے مال میں کچھ خورد برد کرے اور اس کی تقسیم منصفانہ نہ کرے، تو پھر پارٹی والے اسے بے ایمان اور بددیانت قرار دیں گے۔ پارٹی بازی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کا آدمی جب تک دوسروں کے خلاف کچھ کرتا رہے اسے کبھی نہیں ٹوکا جاتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس روش سے رفتہ رفتہ اس کے دل کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کو (ON MERITS) پرکھنے اور عدل و انصاف کی رو سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ مسخ شدہ ذہنیت جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ إِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو تو جھوٹی عزت کا احساس اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (۲/۲۰۶)۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔

مومن، نفس (انیغو) کے اس فریب میں نہیں آتا۔ یہ اس کے راستے میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ دامن جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

اب مومنین کی مثبت صفات کی طرف آئیے۔ ان کے متعلق سورۃ المؤمنون میں کہا گیا ہے کہ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۲۳/۸)۔ یہ لوگ امانات کی حفاظت کرتے ہیں اور عہد کی پابندی۔

پابندئ عہد

حفظِ امانت کے معنی یہی نہیں کہ جو چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھی جائے اسے بحفاظت واپس کر دو۔

ہر وہ بات جسے کسی نے، تم پر بھروسہ کر کے تمہارے سپرد کی ہے وہ امانت میں داخل ہے۔ خواہ وہ اس کا کوئی راز ہو یا اس کی عزت و آبرو کی رکھوالی۔ جہاں تک عہد معاہدہ کا تعلق ہے، اس کے معنی یہی نہیں کہ جو اقرار نامہ کسی کو لکھ کر دو اس پر قائم رہو۔ اس میں ہر قسم کا وعدہ شامل ہے جو ایک انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ یہ بڑی اہم صفت ہے۔ اور اس کی قرآن کریم نے بڑی شدت سے تاکید کی ہے۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱)۔ میں ہر قسم کا عہد اور وعدہ آجاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وعدہ کے معنی کیا ہیں۔ آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "بھائی! اس وقت مجھے جانے دو۔ میں ٹھیک چار بجے آجاؤں گا"۔ تو وہ آپ پر اعتماد کر کے آپ کی بات مان لیتا ہے۔ اگر آپ اپنے وعدے کے مطابق آتے نہیں تو آپ اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بدترین قسم کا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں کسی کو دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں ہر شخص عدم اطمینان کے جہنم میں رہتا ہے۔ بعض لوگ تو وعدہ کرتے ہی منافقت سے ہیں۔ یعنی انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ انہوں نے وعدہ پورا نہیں کرنا۔ لیکن اکثر جذباتی (یا IMPULSIVE) لوگ، شدت جذبات میں آگے بڑھ کر ایک وعدہ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس وعدہ سے پھر جانے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس سے جو نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اسے تو چھوڑیئے۔ خود ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں کوئی عزت نہیں رہتی۔ مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے تو سوچ سمجھ کر۔ اور جب وعدہ کر لیتا ہے تو پھر کچھ بھی کیوں نہ ہو، اسے پورا کرتا ہے — بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۳/۷۶)۔ جو اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے اور یوں قانون خداوندی کی پاسداری کرتا ہے۔ تو یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اطوار و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا، وعدہ شکنی، خواہ وہ شروع ہی میں بدنیتی کا نتیجہ ہو۔ یا بعد میں پھر جانے کی وجہ سے، اس فرد کو ذلیل اور معاشرہ کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے تاکیداً کہا ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ - اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴)۔ اپنے وعدہ کو ہمیشہ پورا کرو۔ اس کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا۔ اور یہ پرسش تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب وعدہ خلافی کرنے والے کو ہر نگاہ حقارت اور نفرت سے دیکھنے لگتی ہے، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معتبر اور معزز کیوں نہ ہو۔

جذباتی لوگ

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۳/۱۸) ہوتے ہیں یعنی ہمیشہ انصاف پر ڈٹ کر کھڑے رہنے والے۔ عدل و انصاف وہ بنیاد ہے، جس پر انسانی سیرت کی عمارت استوار ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم اس باب میں مومنین کے سامنے ایسا بلند معیار رکھتا ہے جس پر پورا اترنے سے معاشرہ فی الواقعہ جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے — يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ — اے ایمان والو! دنیا میں عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو۔ اس باب میں کسی جذبے کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ کچھ خالصتہً للہ کرو۔ اس مقصد کے لئے شہادت دینی پڑے تو دو،

عدل کے علمبردار

کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ بلکہ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور سچی سچی گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ وہ تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ ـــ یا تمہارے والدین کے خلاف جائے۔ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ـــ یا تمہارے دیگر رشتہ داروں کے خلاف ـــ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا ـــ وہ دولتمند ہو یا غریب ہو۔ اس کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے کہ فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا ـــ اللہ کا حق زیادہ ہے۔ اس لئے یاد رکھو۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تم اپنے جذبات کے پیچھے مت چلو۔ اس باب میں، اپنے قلبی رجحانات کو اثر انداز مت ہونے دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات تمہیں عدل کرنے سے روک دیں۔ وَ اِنْ تَلْوٗا۔ نہ ہی تم کوئی پیچدار۔ ذومعنی بات کرو۔ اَوْ تُعْرِضُوْا۔ نہ ہی اس سے عراض برتو۔ پہلو تہی کرو۔ اس لئے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵)۔ جو کچھ تم کرتے ہو خدا کو اس کی خبر ہوتی ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں چھپا سکتے ـــ یہ ہے عدل کا وہ معیار جو ایک مومن کے لئے مقرر کیا گیا ہے ذرا سوچئے کہ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو گا جو اس صفت کے حامل ہوں، اس معاشرہ کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس میں یہ نہیں ہو گا کہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے تو اس کے لئے میزان اور ہوگی اور دوسری پارٹی کے آدمی کے لئے اور ـــ اس میں، تو دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ (۵/۸)۔ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اُس سے بھی عدل کرو۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸)۔ تقوٰی سے قریب ترین روش یہی ہے۔

عدل کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی ایک شکل وہ ہے، جسے عدالتی عدل کہا جاتا ہے، یعنی لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنا۔ اس کے متعلق قرآن کریم کا حکم ہے کہ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴/۵۸) ـ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو ہمیشہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ عدالتی عدل کے معنی یہ ہیں کہ فیصلہ قانون کے مطابق ہو۔ لیکن قرآن کریم

قانون عدل

اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے، خود ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کی رُو سے کیا ہوا فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل کہلا سکے گا۔ ہٰذا، جماعتِ مومنین کے متعلق قرآن کریم میں ہے اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱)۔ یہ جماعت "الحق" کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے اور اسی (الحق) کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ یعنی ان کے قوانین، الحق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور انہی قوانین کے مطابق یہ لوگوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ الحق، قرآن کریم ہے کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)۔ جو لوگ معاملات کے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتے، سو وہی کافر ہیں۔

عدل کی دوسری شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا واجب حق ادا کر دیا جائے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ یہ وہ عدل ہے جو ہر شخص کی زندگی میں قدم قدم پر سامنے آتا ہے اور مومن اس میں ہر مقام پر پورا اترتا ہے۔ آپ سوچئے

واجب حق

کہ جس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کا حق بلا کد و کاوش اور بلا پریشانی و تشویش ملتا چلا جائے، اس میں زندگی کس قدر خوشگوار گزرے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے ایسے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں پھیلانے سے زندگی کا ہر گوشہ اس کے دائرے کے اندر آجاتا ہے۔ اس نے کہا ہے وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۲)۔ "ماپ اور تول کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا کرو"۔ ماپ اور تول میں ہر قسم کے واجبات آجاتے ہیں۔

لیکن قرآن کریم عدل سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ احسان کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، عدل کے معنی ہیں جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ ادا کر دینا۔ لیکن اگر اس سے دوسرے کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو تو قرآن کی تاکید یہ ہے کہ اسے، اس کے واجب سے زیادہ دے کر اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے۔ اسے احسان

احسان

کہتے ہیں جس کے معنی ہیں کسی کے بگڑتے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا اور اس طرح معاشرہ میں حسن پیدا کر دینا۔ اس "احسان" کی ابتدا اپنے گرد و پیش سے کی جائے گی اور اس میں ہر فہرست والدین کا نام آئے گا۔ وَ بِالْوَالِدَيْنِ

والدین سے احسان

اِحْسَانًا (۴/۳۶)۔ آپ حیوانات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہاں، ماں باپ اپنے بچے کی پرورش تو کرتے ہیں لیکن بچے اپنے والدین کو پوچھتے تک نہیں۔ وہ انہیں جانتے پہچانتے بھی نہیں۔ یہ خصوصیت انسانی زندگی میں آکر پیدا ہوتی ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو اولاد ان کی خبر گیری کرے۔ والدین کے بعد دوسرے لوگ بھی اسی زمرے میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَ بِذِي الْقُرْبٰى۔ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ "یہی احسان دیگر اقربا سے بھی کرو۔ اور ان لوگوں سے بھی جو معاشرہ میں کسی وجہ سے تہی دست رہ گئے ہوں۔ یا جو حرکت کے قابل نہ رہیں اور ان کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ۔ نیز ہمسایہ سے بھی، خواہ وہ قریب کا ہو یا دور کا اپنوں میں سے ہو یا بیگانوں میں سے۔ نیز اپنے رفقائے کار کے ساتھ بھی۔ اور ان مسافروں کے ساتھ بھی جن کے پاس زادِ راہ نہ رہا ہو، یا وہ ویسے ہی تمہارے حسنِ سلوک کے مستحق ہوں۔ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۳۶)۔ اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو تمہارے ماتحت کام کریں۔ ان سب کے ساتھ عدل کرو۔ ان کے حق میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ اور اگر اس کے باوجود، ان میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کو بھی پورا کرو۔ اور اس کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ کہ تم نے ان پر کوئی احسان کیا ہے، چہ جائیکہ اس احسان کی وجہ سے تم ان پر بار گراں بن جاؤ۔ اور انہیں خواہ مخواہ قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتے رہو۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى (۲/۲۶۲)۔ وہ کسی کو کچھ دے کر اس کے سر پر سوار نہیں ہو جاتے۔ سر پر سوار ہونا تو ایک طرف، وہ ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا

شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ ہم تم سے اس کا بدلہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵/۶۰)۔ اس کمی کی وجہ سے تمہارا توازن بگڑ رہا تھا۔ ہم نے اس توازن کو برقرار کر دیا۔ بس یہی اس کا بدلہ ہے۔ دوسروں کی کمی کو پورا کرنے کے سلسلہ میں، وہ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔

یہ تو احسان کی صورت ہے جس میں کچھ واپس لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی کو قرض دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مقروض کی حالت سقیم ہے تو اس پر سختی نہیں کرتے بلکہ اسے اس وقت تک کی مہلت دیتے ہیں

مقروض سے نرمی جب تک وہ آسانی سے قرض ادا کر دینے کے قابل نہ ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو کہ وہ قرضہ ادا کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تو قرض معاف کر دیتے ہیں۔ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۲۸۰)۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی یہ خصوصیات ہوں وہ کسی کا مال ناحق کس طرح کھا جائیں گے اور جائز اور ناجائز کی تمیز کو کس طرح مٹا دیں گے؟ انہیں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ

ناحق مال نہ کھاؤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۱۸۸)۔ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرا لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

یہاں تک ضبطِ نفس کی ان حدود کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ اس کے بعد جنسی جذبات میں ضبط و تحدید کی صورت سامنے آتی ہے۔ اس باب میں مومن انتہائی پاکبازی کا مظہر ہوتے ہیں۔

حفاظتِ عصمت هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳/۵)۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عصمت و عفت کا لفظ صرف عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ مردوں سے بھی اسی طرح عصمت کا مطالبہ کرتا ہے جس طرح عورتوں سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومنین، زنا تو خیر بہت دور کی بات ہے، فواحش (یعنی عام بے حیائی کی باتوں) کے بھی قریب تک نہیں پھٹکتے، خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ (وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۶/۱۵۱))۔ خود بھی بچتے ہیں اور اس قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن سے اس قسم کی باتیں معاشرہ میں پھیلنے نہ پائیں (۲۴/۱۹)۔ وہ اپنی نگاہوں کو

کبھی بے باک نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان سے کہا گیا ہے کہ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ (۲۴/۳۰) - اپنی نگاہوں کو بیباک مت ہونے دو۔ وہ جنسی بے راہ روی کے خیال تک کو اپنے دل میں نہیں آنے دیتے، اس لئے کہ ان کا ایمان ہے کہ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)۔ خدا نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔

خیالات کی پاکیزگی

علاوہ بریں، عام جذبات میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انہیں کبھی بے لگام اور حدود فراموش نہیں ہونے دیتے - اگر کبھی ان میں شدت پیدا بھی ہو تو وہ تخریب کی بجائے، ان کا رخ تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اسی لئے مومنین کی خصوصیت کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (۳/۱۳۳) بتائی گئی ہے - اس کے معنی "غصے کو دبا لینے والے" نہیں - اس کے معنی ہیں اس زائد قوت کو تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دینے والے۔ اس کے بعد ہے وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (۳/۱۳۳)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے مقامات پر یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں (تاکہ وہ بھی ویسا ہی برتاؤ ان کے ساتھ کریں)۔ وہ ان کے برتاؤ سے قطع نظر کر کے، دیکھتے یہ ہیں کہ انہیں قوانین خداوندی کے مطابق کیا کرنا چاہیئے - ان کے جذبات کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

جذبات پر قابو

وہ انہیں ہمیشہ اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں - اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ شیطان ان پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتا - اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ حتیٰ کہ اگر کبھی اس قسم کا کوئی خیال یونہی گھومتے پھرتے ان کے دل میں آ جائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اور اس سے یوں ہوتا ہے گویا ایک دم روشنی ان کے سامنے آ گئی اور انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱)۔ زندگی کے ہر شعبے میں، قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا، یہ ہے وہ سب سے بڑی قوت جس سے مومنین، غلط باتوں کے ارتکاب سے مجتنب رہتے ہیں۔ اس کو ذِکْرُ اللّٰہِ کہتے ہیں۔ ان قوانین کی خلاف ورزی سے جو تباہیاں آتی ہیں، ان کا احساس

خشیتِ قلبی

انہیں لرزا دیتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب قوانین خداوندی کا مجموعی تصور ان کے سامنے آتا ہے تو ان کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اس کے احساس سے ان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (۸/۲)۔ اور جب ان قوانین کی تفاصیل ان کے سامنے آتی ہیں تو ان پر عمل پیرا ہونے کے خوشگوار نتائج کے تصور سے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ ان قوانین کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ قوانین خداوندی پر اعتماد کلی اور یقین کامل ہے جس سے انہیں استقامت حاصل ہوتی ہے اور ان کے پاؤں میں کبھی لغزش نہیں آتی۔ اسی لئے انہیں الصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ (۳/۱۶)۔ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی مستقل مزاج ... مصائب زندگی میں ہمت کر کے صبر سے ... ہونے والے۔ اپنے

دعوائے ایمان کو اپنے اعمال سے سچ کر دکھانے والے۔ اور قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع کرنے والے۔ اپنی تمام توانائیوں کو ان کے مطابق صرف کرنے والے۔

جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی عقل و فکر سے عاری نہیں ہوتے اپنا دماغی توازن کبھی نہیں کھوتے۔ ہر معاملہ پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے صحیح نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے انہیں اُولُو الْاَلْبَاب (۳/۱۹۰) کہہ کر پکارا ہے۔

صاحبانِ عقل و بصیرت

یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کر کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس عظیم الشان کارگہِ کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ ان کے عقل و فکر سے کام لینے کی کیفیت یہ ہے کہ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (۲۵/۷۳)۔ اور تو اور جب ان کے سامنے ان کے رب کے احکام و قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انہیں غور و فکر سے قبول کرتے اور علم و بصیرت کی رو سے ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح وحیِ خداوندی پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے جذبات کو اس وحی کے تابع رکھتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ اس سے بڑھ کر راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ یوں وحیِ خداوندی، علم و عقل اور جذبات کے حسین امتزاج سے مردِ مومن کا قالب تیار ہوتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　　یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال　　　عجم کا حُسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

اور ظاہر ہے کہ جب مومنین تو کسی بات کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرتے ہیں نہ تسلیم تو وہ دوسروں سے اپنی بات کس طرح دھاندلی سے منوا سکتے ہیں۔ وہ اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کی رو سے پیش کرتے اور علم و بصیرت کی رو سے منواتے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸)۔

دلائل و براہین

میں تمہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرتا ہوں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ ہماری دعوت علم و بصیرت پر مبنی ہوگی۔ اسی لئے جماعتِ مومنین سے تاکید کی گئی کہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۶/۱۲۵)۔ تم لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف اس انداز سے دعوت دو کہ ان کے

دل اور دماغ دونوں کی تسکین ہو جائے۔ وہ اسے ذہن اور قلب کی پوری رضامندی کے ساتھ مانیں۔ اور جو اعتراضات وہ پیش کریں ان کا جواب نہایت حسن کارانہ انداز سے دو۔ یونہی اندھا دھند مت جھگڑتے چلے جاؤ۔ فرعون جیسے سرکش اور متکبر کو بھی پہلے نرمی اور آشتی سے سمجھانے کی کوشش کرو۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۲۰/۴۴)۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح بات اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ اپنی سرکشی کے تباہ کن نتائج سے ڈر جائے۔ لیکن اگر واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ جائے جو اپنی ضد اور جہالت پر اڑے رہنا چاہیں اور کسی بات پر دھیان دینے کی کوشش ہی نہ کریں، تو ان سے اعراض برتو۔ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۷/۱۹۹)۔ لیکن اس کے باوجود ایسے موقعہ کی تلاش میں رہو کہ وہ بات سننے پر آمادہ ہوں تو ان تک پھر خدا کا پیغام پہنچاؤ۔ وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ تاکہ وہ اپنی غلط روی کے باعث قرآن کی راہ نمائی سے محروم نہ رہنے پائیں۔

اپنی اصلاح

لیکن دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کہنے والا خود اپنی اصلاح کرے۔ جماعتِ مومنین کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ وہ پہلے خود عمل کرتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۲-۳)۔ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اللہ کے نزدیک یہ انداز بڑا ناپسندیدہ ہے کہ تمہارے قول اور فعل میں تضاد ہو۔ ایسی نصیحت جس پر انسان خود عمل نہ کرے، محض شاعری بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اس قسم کی روش مومن کا شعار زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قرآن میں آیا ہے کہ وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ شاعری اس کے شایانِ شان ہی نہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے شاعر اور مومن کو ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں شاعروں کی یہ خصوصیات بتائی ہیں کہ وہ اپنے تصورات کی دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی اس وادی میں۔ کبھی اس بیابان میں۔ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے جھوٹی پیاس ادھر ادھر لئے پھرے۔ اور ان کی ساری عمر باتیں کرنے میں گزر جاتی ہے عمل کے قریب وہ نہیں پھٹکتے۔ ان خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۶/۲۲۷)۔ لیکن مومنین اس قسم کے نہیں ہوتے۔ وہ ابدی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مطابق کام کر کے دکھاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بات کلام موزوں میں پیش کرے تو وہ قابلِ مذمت ہے اور اگر وہ اسے نثر میں بیان کرے تو قرآن کی رُو سے مستحسن۔ بات نثر اور نظم کی نہیں بات اس ذہنیت کی ہے جسے قرآن نے شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ اس ذہنیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کا کوئی متعین مقصد اور نصب العین نہ ہو۔ وہ اپنے جذبات کی رو میں جو جی میں آئے کہتا چلا جائے اور جو کچھ کہے اس میں بھی تصنع اور بناوٹ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ

شاعری مت کرو

ساری عمر باتیں کرتا رہے ان پر عمل کبھی نہ کرے۔ ذہنیت اس کی یہ ہو اور وہ اسے نوائے سروش سے تعبیر کرکے اپنے آپ کو صاحبِ وجدان قرار دے۔ یہ ہے وہ ذہنیت جسے مومن کی ذہنیت کی ضد قرار دیا گیا ہے، خواہ اس ذہنیت کا حامل نثر میں بات کرے یا نظم میں۔ مومن کے سامنے ایک متعین نصب العین حیات ہوتا ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ چھوٹی موٹی لغزشیں مومنین سے بھی ہو جاتی ہیں ——— یہ معصوم عن الخطا نہیں ہوتے ——— لیکن یہ لغزشیں ان سے سہو و خطا کی بنا پر نادانستہ سرزد ہوتی ہیں جن سے وہ فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ بنیادی غلط روی سے ——— جسے قرآن نے کبائر سے تعبیر کیا ہے ——— ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲)۔ مومن وہ ہیں جو بنیادی غلط کاریوں اور بے حیائی کی باتوں سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے کبھی کبھار نادانستہ کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے۔ لہٰذا مومن کا انداز یہ ہے کہ وہ جس بات کی دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اس پر پہلے خود عمل کرتا ہے۔

چھوٹی موٹی لغزشیں

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس کی غلطی پر ٹوکے تو وہ اُسے یہ کہہ کر جھٹک دے کہ میاں! پہلے اپنی اصلاح تو کرو۔ پھر دوسروں سے کہنا۔ نہیں! مومن کا یہ شعار نہیں۔ وہ کہنے والے کی بات کو توجہ سے سنتا ہے۔ پھر اپنا جائزہ لیتا ہے اور اگر دیکھتا ہے کہ اس میں واقعی وہ کمزوری موجود ہے تو اس کی اصلاح کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس اصول کو پیشِ نظر رکھتا ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (۵/۱۰۵)۔ تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر جا رہے ہو، تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے جو شخص تمہاری غلط روی پر ٹوکتا ہے اس کی بات سننے سے یہ کہہ کر انکار نہ کرو کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے تو تمہیں دوسروں کو نصیحت کرنے کا کیا حق ہے؟ تمہیں تمہاری غلط روی کا نقصان پہنچے گا۔ اس کی غلط روی کا نہیں۔ اس لئے کہ وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۴)۔ ہر شخص اپنی غلط روی کا خمیازہ خود بھگتے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اعتراض کی بجائے اصلاح

لیکن اپنی اصلاح کرنے کے بعد، مومن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہ ہر ایک پر اپنی نیکیوں کی دھونس جماتا رہتا ہے اور معاشرہ میں بڑا پاکباز بن کر اپنے آپ کو فریب دیتا اور دوسروں پر رعب گانٹھتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ اس لئے کہ اس کے سامنے یہ اصول ہوتا ہے کہ فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۵۳/۳۲)۔ یونہی اپنے آپ کو پاکباز نہ ٹھیراتے پھرو۔ اس کا فیصلہ میزانِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے کہ تم میں سے کون تقویٰ شعار ہے۔ مومن کا تو شعار یہ ہے کہ اس میں جس قدر زیادہ خوبیاں

اپنی پاکبازی کی دھونس نہ جماؤ

پیدا ہوتی جاتی ہیں، وہ اسی قدر (شاخ ثمردار کی طرح) اور جھکتا چلا جاتا ہے۔ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵/۶۳)۔ اللہ کے بندوں کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھوٹا تکبر پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خوبیوں کا وزن انہیں اور جھکا دیتا ہے۔

لیکن جھکنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہر ایک سے دبتے چلے جاتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ وہ جھکتے ہیں حق کے سامنے۔ لیکن

باطل کا مقابلہ کرتے ہیں

جو حق کی مخالفت کرتا اور اس سے سرکشی برتتا ہے۔ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کہا گیا ہے (یعنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بڑی محبت اور نرمی سے سلوک کرنے والے) وہاں انہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ (۲۹/۴۸) بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی حق کی مخالفت کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت۔ یعنی مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ آپؐ اس قدر نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو آپ کی جماعت کے افراد آپ سے الگ ہو جاتے" (۳/۱۵۹)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ سے تاکیداً کہا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (۹/۷۳)۔ اے نبی! جو لوگ حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ یا جو تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، منافقانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان سے جہاد کرو۔ اور ان کے خلاف شدت اختیار کرو۔ یعنی جو لوگ کھلے بندوں حق کی مخالفت کریں اور سرکشی اختیار کریں۔ یا جو لوگ منافقت برتیں، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ ان کی مخالفت یا منافقت کو سختی سے روکا جائے گا۔ یاد رکھئے!

منافق کی مخالفت

مومنین کے معاشرہ میں، منافقین کا وجود — یعنی وہ لوگ جو بظاہر کچھ اور بات کریں اور ان کے دل میں کچھ اور ہو — ایک زہر آلود پھانس ہوتی ہے، جس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے اگر نوکِ نشتر کی بھی ضرورت پڑے تو اس میں بھی تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ مومن کی نرم مزاجی کے یہ معنی نہیں کہ وہ منافقین کے سامنے بھی جھک کر رہتا ہے۔ ایسا کرنا تو خود منافقت اور مداہنت ہوگی۔ وہ منافق سے برملا کہہ دیتا ہے کہ تم منافقت برتتے ہو۔ ہم تمہارے دوست نہیں ہو سکتے ..... اور دوسروں کو بھی اس کی منافقت سے آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ کسی کو دھوکا نہ دے سکے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم بڑی واضح اور اس کی تاکید بڑی سخت ہے۔ اس لئے مومنین، حق کے مخالفین اور منافقین سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ تمہارے ساتھ

ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ تم ہمارے دوست اور رازدار نہیں ہو سکتے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (۹/۲۳)۔

اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں، تو انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ تم میں سے جو کوئی انہیں اپنا دوست رکھے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں۔

انتا ہی نہیں۔ عزیز سے عزیز دوست۔ قریبی سے قریبی رشتہ دار۔ بیوی بچے۔ مال و دولت۔ سامانِ زیست۔ متاعِ حیات۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی چیز بھی، مومن کے نزدیک، ایمان اور اسلامی نظام کے مقابلہ میں عزیز نہیں ہو سکتی۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ وجہِ جاذبیت ہیں۔ لیکن جب ان میں اور ایمان کے کسی تقاضے میں تصادم ہو، تو ان میں سے کسی شے کو بھی ایمانی تقاضے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے اور مومنین کا شعار۔ ان کے خدا کا حکم یہ ہے کہ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ۔ بہن بھائی۔ بیوی بچے۔ عزیز رشتہ دار۔ وہ مال و دولت جسے تم اتنی محنت سے کماتے ہو۔ وہ کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو اور وہ محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ۔ تمہیں خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ تو تم انتظار کرو۔ تا آنکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہاری اس روش کا تباہ کن نتیجہ تمہارے سامنے لے آئے۔ تمہاری یہ روش مومنین کی روش نہیں۔ فاسقین کی ہے۔ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (۹/۲۴)۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ فاسقین پر — یعنی جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلیں۔ کبھی کامیابیوں کی راہ کشادہ نہیں ہوتی۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنا مال اور جان، سب خدا کے ہاتھ بیچ دیئے ہوتے ہیں۔ جس دن وہ خدا پر ایمان لاتا ہے خدا اس کا اعلان کر دیتا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ مسن رکھو کہ اللہ نے مومنین کا جان اور مال، جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

ایمان کے معنی

مال اور جان خدا کے

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ (۹/۱۱۱)۔ وہ خدا کی

راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس لوٹتے ہیں۔ اور یا میدانِ جنگ میں جان دیدیتے ہیں۔ ان مومنین کی صفات یہ ہیں کہ التَّائِبُوْنَ۔ سفر حیات میں وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ ان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا ہے، وہ وہیں رک جاتے ہیں۔ اور جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا وہاں واپس آکر صحیح راستے پر ہو لیتے ہیں۔ اَلْعَابِدُوْنَ۔ وہ قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اَلْحَامِدُوْنَ۔ وہ انفس و آفاق کی ہر شے

مومنین کی صفات

پر غور و فکر کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کارگہ کائنات کی ایک ایک شے اپنے خالق کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اَلسَّائِحُوْنَ۔ وہ اس مقصد کے لئے دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں۔ اَلرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ۔ وہ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ اور دل کے پورے جھکاؤ سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اَلْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وہ ان تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی نے متعین کیا ہے اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹/۱۱۲)۔ یہ ہیں وہ مومن جن کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ صفات جن کے حامل انسان کو مومن کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ان تمام صفات میں

مردوں اور عورتوں دونوں کی خصوصیات

مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن کریم میں مومن کی کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو صرف مردوں کے لئے مخصوص ہو اور اس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ اگرچہ خود لفظ "مومنین" کے اندر مرد اور عورتیں از خود شامل ہیں لیکن قرآن کریم نے ایک مقام پر مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر اس طرح شانہ بشانہ کیا ہے کہ مصافِ زندگی میں دونوں ایک ہی صف میں، ساتھ ساتھ چلتے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی آیت (۳۳/۳۵) کو دیکھئے۔ اس میں کس وضاحت اور صراحت سے کہا گیا ہے کہ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ) اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ) اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ) اگر مرد اپنے دعوئے ایمان کو اعمال سے سچ کر دکھانے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ) اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے

ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْخَاشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے (وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ) اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں، تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَالصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ لہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا)۔ سورۂ توبہ میں مومنین کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے (اور جنہیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے) ان میں ایک صفت السَّآئِحُوْنَ بھی ہے۔ یعنی دنیا کا سفر یا سیر و سیاحت کرنے والے۔ عورت کے متعلق جو نظریہ ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، اس کے پیشِ نظر خیال گزر سکتا تھا کہ کم از کم اس صفت میں مومن عورتیں شریک نہیں ہوں گی۔ قرآن کریم نے السّٰٓئِحٰتِ (۶۶/۵) کا ذکر خاص طور پر کر کے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا اور اس کی وضاحت کر دی کہ اس صفت میں بھی مومن عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

یہ ہیں وہ صفات و خصائص جن کے حامل افراد سے قرآن وہ امت تشکیل کرتا ہے جو تمام عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک مرکزی اُمت بنا دیا۔ تاکہ تم عالمِ انسانیت کے اعمال کی نگرانی کرو (کہ وہ حق و انصاف پر قائم رہیں) اور تمہارا رسول تمہارے اعمال کی نگرانی کرے کہ تم نظامِ خداوندی کے مطابق چلتے رہو۔ دوسری جگہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے ــــ یہ بھلائی کیا ہے؟ یہ کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)۔ تم ان باتوں کا حکم دیتے ہو جنہیں وحیِ خداوندی مستحسن قرار دیتی ہے اور ان سے روکتے ہو جنہیں وہ ناپسندیدہ ٹھیراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ (مومنین) پہلے اپنی زندگی وحیِ خداوندی کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ پھر ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس سے دوسرے لوگ بھی وحی کا اتباع کرتے جائیں۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں نظامِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اور مقصد اس تمام تگ و تاز سے یہ ہے کہ تمام افرادِ انسانیہ کو وہ ذرائع اور سامان میسر آتا رہے جس سے اس کے جسم اور ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ اسے

ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعتِ مومنین کے ان بنیادی فرائض (ذمہ داریوں) کو بار بار دہرایا گیا ہے ۔۔۔ وَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ (۴/۲)۔ حتیٰ کہ ان کی مملکت اور حکومت کی غرض و غایت بھی یہ بتائی گئی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور نوعِ انسان کی نشوونما کا انتظام کریں گے۔ ان باتوں کا حکم دیں گے

اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ

جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اور ان کے تمام معاملات منشائے خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام کیا جاتا ہے کہ اسلام میں، عورتوں کو شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جو آیت ابھی ابھی آپ کے سامنے آتی ہے اس میں اسلامی حکومت کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بتایا گیا ہے، اور دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ فریضہ مردوں اور عورتوں دونوں کا ہے۔ تنہا مردوں کا نہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.... (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

بہرحال، کہا یہ جا رہا تھا کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ دنیا سے برائیوں کی روک تھام کا انتظام کریں گے۔ لیکن یہ روک تھام اندھی قوت کے استعمال سے نہیں ہو گی۔ وہ بھلائیوں کو اس قدر عام کرتے چلے جائیں گے کہ برائیاں خود بخود اپنی جگہ چھوڑتی جائیں۔ جس طرح تاریکی دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ روشنی لے آئیے۔ وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳/۲۲)۔ البتہ جو لوگ نظامِ حق و صداقت کے خلاف سرکشی پر اتر آئیں اور ظلم و استبداد سے کسی طرح باز نہ آئیں، تو خلقِ خدا کو ان کے جور و ستم سے محفوظ رکھنے کے لئے، قوت کا استعمال بھی کریں گے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے

شمشیرِ مومن

لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا کہ وہ لوگوں کو علم و بصیرت کی رو سے حق کی دعوت دیں۔ پھر ان کے ساتھ ضوابط قانون بھی نازل کئے کہ دنیا میں عدل قائم رکھا جا سکے۔ لیکن جو لوگ نہ دلائل و براہین کی رو سے مانیں۔ نہ قانونِ عدل و انصاف کی پابندی اور احترام کریں تو ان کے لئے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (۵۷/۲۵)۔ ہم نے شمشیرِ خارا شگاف نازل کی۔ جماعتِ مومنین شمشیر کا استعمال مظلوم کی حمایت اور ظالم کے ظلم کی مدافعت کے لئے کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر دنیا کی

کوئی اور قوم کسی قسم کی کوشش کرتی ہے تو جماعتِ مومنین ان کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ لیکن غلط کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہیں کرتی۔۔ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (۵/۲)۔

تعاون

ان کا شعار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵)۔ جو کسی اچھے کام میں دوسرے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اور جو کسی خراب کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے، تو اس کے مضر نتائج کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ بلند مقاصدِ حیات جن کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے

ربط باہمی

زندگی کی متلاطم ندیوں کو مردانہ وار پار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳/۱۹۹) تم اپنے مسلک پر نہایت استقامت سے جمے رہو اور ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر رہو۔ اور ہر قدم پر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی وہ روش ہے جسے تمہیں سفرِ حیات میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر، كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے کہ حوادثِ زمانہ کی سرکش موجیں اس سے آکر ٹکرائیں تو اپنا سر پھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں۔ ان کے اس ارتباطِ باہمی اور باہمد گر پیوستگی کا ذریعہ، تمسک بالقرآن (خدا کی کتاب کے ساتھ وابستگی) ہوتا ہے کہ ان سے کہا گیا ہے کہ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ تم خدا کی کتاب کے ساتھ سب کے سب مل کر، پوری مضبوطی سے وابستہ رہو۔ اور آپس میں تفرقہ پیدا مت کرو۔ اس لئے کہ باہمی تفرقہ ۔۔ امت کا فرقوں میں بٹ جانا ۔۔ توحید نہیں شرک ہے۔ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱)۔ دیکھنا! تم کہیں (اسلام لانے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔

تفرقہ شرک ہے

یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے۔ اس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ ہمیں حق پر ہوں (اور باقی سب باطل پر ہیں)۔ (اور یوں امت کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس وحدت اور استقامت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر رحمتوں کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ جو انہیں دنیا اور آخرت میں زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں دیتے ہیں۔ اِنَّ

نزولِ ملائکہ

الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے۔ اور پھر اس دعویٰ پر جم کر کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کھاؤ۔ نہ افسردہ خاطر ہو۔ اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ۔ ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق اور ساتھی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ وَ لَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَ لَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ - (۴۱/۳۰-۳۱)۔ تمہیں دنیا اور آخرت میں، جو تمہارا جی چاہے گا ملے گا۔ جو مانگو گے، پاؤ گے۔ ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں تمہارے حصے میں آئیں گی۔ اور یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوں گی۔ تِلْکُمُ الْجَنَّۃُ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳)۔ یہ وہ جنت ہے جس کے تم، اپنے اعمال کی وجہ سے، مالک بنائے گئے ہو۔

یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حامل انسانوں کو مومن کہا گیا ہے۔ انہیں زندگی کی جن خوشگواریوں اور سربلندیوں کی بشارت دی گئی ہے، وہ انہی خصوصیات کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔ محض مومن کہلانے اور مسلمان نام رکھا لینے سے یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ (۴/۱۲۳)۔ یہ نتائج نہ تمہاری خوش فہمیوں سے حاصل ہو سکتے ہیں نہ ان اہل کتاب کی خالی تمناؤں سے۔ یہ تو صرف ان خصوصیات کے پیدا کرنے سے حاصل ہوں گے جنہیں مومنین کی صفات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی میں یہ خصوصیات موجود نہ ہوں، اور وہ نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جیسے "دینی اعمال" پر بھی میکانکی طور پر کاربند ہو، تو بھی یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے

نیکی کا صحیح مفہوم

نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ۔ نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ الْکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ تم ان بلند حقیقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھو جنہیں اجزائے ایمان کہا گیا ہے ـــ یعنی خدا اور اس کے قانونِ مکافات پر ایمان۔ زندگی کے تسلسل پر ایمان۔ وحی کی رُو سے دیئے ہوئے ضابطۂ قوانین پر ایمان۔ انبیاء اور ملائکہ پر ایمان ـــ نیکی اس کی ہے جو ان حقیقتوں پر یقینِ محکم رکھے اور وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ۔ اور پھر مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے دیدے۔ وہ رشتے دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے یا ان میں کام کاج کی استعداد نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ یا وہ دوسروں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہوں۔ ان مقاصد کے لئے مال و دولت کا وقف کر دینا۔ یہ نیکی ہے۔ مختصر الفاظ میں نیکی یہ ہے کہ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں تمام افراد معاشرہ قوانینِ خداوندی

اتباع کریں اور نوع انسان کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج نیکی ان کی ہے جو اپنے عہد و پیمان کا احترام کریں اور قول اقرار کے سچے ہوں۔ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اور جب مشکلات کا سامنا ہو تو نہایت ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کریں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (۲/۱۷۷) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو اپنے اعمال سے سچا ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں وہ جو متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ نہ وہ جو محض رسمی طور پر نماز روزہ کی پابندی کر کے اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم پکے مومن ہیں اور بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ ایسے خیراتی کام جنہیں عام طور پر "کارِ خیر" سمجھا جاتا ہے، وہ بھی نظام خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ میں ہے اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے

خیرات کے کام

سبیلیں لگا دینے والا یا خانہ کعبہ کی زیبائش و آرائش اور آبادکاری کے کاموں میں حصہ لینے والا، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اخروی پر ایمان رکھے اور نظام خداوندی کے قیام کے لئے مسلسل جد و جہد کرتا ہے! تم اپنی خوش عقیدگی کی بنا پر کچھ ہی کیوں نہ سمجھو۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ط میزانِ خداوندی میں، یہ دونوں کبھی ہم وزن نہیں ہو سکتے۔ ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۹/۱۹)۔ اور خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قسم کی زیادتی کرنے والوں پر کامیابی کی راہیں کبھی نہیں کھلا کرتیں۔ یہودیوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ اسی قسم کی خود فریبی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے معاشرہ کا نظام ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں معاشرہ کے کمزور، غریب، ناتواں افراد، اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نکل جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جب وہ اس طرح باہر نکل کر غیر محفوظ ہو جاتے اور دوسروں کے چنگل میں پھنس جاتے تو پھر یہی ابنائے وطن جن کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، خیرات کے پیسوں سے ان کا فدیہ ادا کرتے اور سمجھتے کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (۲/۸۵)۔ حالانکہ ایسا نظام قائم کرنا جس میں معاشرہ کے غریب اور کمزور افراد، مظلومیت کا شکار ہو جائیں، ایسا جرم عظیم ہے جس کا کفارہ اس قسم کے خیرات کے کام کبھی نہیں بن سکتے۔ جماعتِ مومنین اس قسم کی خود فریبی کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ نظام ایسا قائم کرتے ہیں جس میں اس قسم کے انفرادی خیراتی کاموں کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو انفرادی طور پر دیانتدار ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انہیں نظام خداوندی کی طرف آنے کے لئے دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ اس قسم کا ہوتا ہے جس میں ان کی انفرادی نیکیاں خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ دیکھئے۔ قرآن اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْہُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّہٖۤ اِلَیْکَ ۚ وَ مِنْھُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْہُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖۤ اِلَیْکَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْہِ قَآئِمًا ؕ ان اہل کتاب میں وہ بھی ہے جس کے پاس اگر چاندی سونے کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دیا جائے تو وہ اسے جوں کا توں واپس کر دے۔ اور ایسا بھی کہ اگر اس پر ایک روپے کا بھی اعتماد کر دو تو وہ اسے کبھی واپس نہ کرے بجز اس کے کہ تم اس کے سر پہ ڈنڈا لے کر سوار رہو۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ یہ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ قومی عصبیت کی بنیادوں پر قائم ہے جس میں یہ عقیدہ دل کی گہرائیوں میں راسخ کر دیا جاتا ہے کہ تم دوسری اقوام کے لوگوں کے ساتھ جو جی میں آئے کرو۔ اس سے تم پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ ان کے مذہبی پیشوا انہیں یہ بتلاتے ہیں کہ یہ شریعت خداوندی کے عین مطابق ہے حالانکہ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ ٥ (۳/۷۵)۔ یہ خدا کے خلاف صریح کذب و افترا ہے اور ایسا کہنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔

قرآن کریم نے مثال تو یہودیوں کی دی ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتے تھے جس میں ان کے کمزور اور غریب بھائی گھروں سے بے گھر ہونے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح جب وہ دوسروں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تھے تو انہیں چھڑانے کے لئے فنڈ اکٹھا کرتے تھے اور اسے بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ لیکن اس سے اس نے اصول بہت بلند پیش کیا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں غریب لوگ محتاج سے محتاج تر ہوتے جائیں اور اس کے بعد ان کی طرف خیرات کے چند ٹکے پھینک کر یہ سمجھنا کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا ہے جرم عظیم ہے فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ..... (۲/۸۵)۔ جو قوم بھی ایسا کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگی اور آخرت میں بھی سخت عذاب کی مستحق۔

مومن اور مسلم کا فرق

بہر حال یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حاملین کو مومن کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومن اور مسلم کے الفاظ اکثر مقامات پر ہم معنی استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایک جگہ ایسی تشریح بھی کی گئی ہے جس سے، بعض گوشوں میں، ان دونوں کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ سورہ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ یہ بدوی قبائل، جو اسلامی مملکت کے قیام کے بعد، مسلمان ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا۔ ان سے کہو کہ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لائے اور اس طرح مومن بن گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ابھی تک ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ...... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ

وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (۴۹/۱۵)۔ مومن کہلانے کے مستحق وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر دل کی کامل رضامندی سے ایمان لاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ کا گزر تک نہیں ہوتا۔ پھر وہ، اپنی جان اور مال سے، خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جو اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہوتے ہیں۔

اس سے ہمارے سامنے مسلم اور مومن کا فرق آجاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مسلم وہ ہے جس سے احکام خداوندی کی اطاعت، قانون کے ذریعے کرائی جاتی ہے، اور ان احکام کی اطاعت کا جذبہ جس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے، اسے مومن کہتے ہیں۔ مومن کی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما اس طرح ہوجاتی ہے کہ وہ تمام صفات و خصوصیات جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، اس کے مختلف گوشے (FACETS) بن جاتے ہیں، اس لئے وہ ان صفات کا فطری مظہر ہوتا ہے جس طرح سورج، روشنی اور حرارت کا فطری مظہر ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اندر، مسلم ان قوانین کی اطاعت سے رفتہ رفتہ ان اثرات کو اپنے دل میں جذب کرتا جاتا ہے، اور یوں اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ تاآنکہ وہ بھی مقام مومن تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے جہاں اعراب سے کہا گیا ہے کہ وہ ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہیں کیونکہ ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا، وہاں ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۴۹/۱۴)۔ اگر تم نظام خداوندی کی اطاعت کرتے جاؤ گے تو تمہارے اعمال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔ ان کے نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس طرح تخریبی عناصر سے تمہاری ذات کی حفاظت ہوجائے گی اور اسکی نشوونما کا سامان بھی تمہیں ملتا جائے گا۔ بشرطیکہ تم نے یہ اطاعت، محض رسمی طور پر نہ کی۔ ورنہ مسلم کے مسلم ہی رہو گے۔ مومن نہیں بن سکو گے۔ اسلامی نظام درحقیقت، اس تبدیلی کے خارجی اثرات کا نام ہے جو جماعت مومنین کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔

نفسیاتی تبدیلی

اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، نظام خداوندی متشکل ہی نہیں ہوسکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ یعنی خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک اس قوم کے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہوجائے۔ یہ ایسی سنت اللہ (خدا کا اٹل قانون) ہے جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ جماعت مومنین، اسی نفسیاتی تبدیلی کا مظہر ہوتی ہے اور یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس قرآن پر صحیح ایمان سے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ایک چیز ہے اسلام کی دعوت کا فکری طور پر سمجھنا اور اس طرح ذہنی طور پر اس کی صداقت کا معترف ہوجانا۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغ میں اس دعوت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے اور اس کے خلاف منطقی دلائل اور فلسفیانہ اعتراضات اسے ڈگمگا نہیں دیتے۔ لیکن ایمان کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے، جب اس دعوت کے کسی تقاضے (یعنی مستقل قدر) اور انسانی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے میں (خواہ وہ محض جذباتی بات ہو یا محسوس مفاد کا سوال) تصادم ہو اور وہ طبیعی زندگی کے تقاضے پر مستقل قدر کے تقاضے کو ترجیح دے۔ یہ ہے وہ ایمان جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی کے حاملین کو مومن کہتے ہیں جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○ (۲/۱۵۷)۔

میں اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم نے مومن اور مسلم میں مستقل طور پر یہ تفریق کی ہے۔ بالکل نہیں۔ اس نے مومن اور مسلم کے الفاظ مرادف معنوں میں استعمال کئے ہیں اور مومنوں کی عظیم ترین شخصیتوں —— حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرامؑ مع جناب نبی اکرمؐ ـ کو مسلم کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے فرق یہ بتایا ہے کہ جو لوگ کسی مصلحت کی خاطر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں انہیں اپنے آپ کو مومن نہیں کہنا چاہیے تا آنکہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہ ہو جائے۔ ورنہ، عام معنوں میں، مومن کی طرح مسلم بھی وہ ہیں۔ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (۲/۱۱۲)۔ جس نے اپنی تمام خواہشات اور توجہات کو قوانین خداوندی کے تابع رکھا اور اس طرح نہایت متوازن زندگی بسر کی۔ سو اس کے اعمال کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے پاس ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ اسے نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ لہٰذا مومن اور مسلم وہ ہے جسے نہ خارج سے کسی قسم کے خطرہ کا خوف ہو اور نہ داخلی طور پر اس کے دل میں یاس و حزن کا گزر ہو —— یہ ہے مقامِ مومن اور اندازِ مسلم۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں!
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں!
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوزِ دروں!

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے؟

پرویز

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور مبنی برایمان دعوےٰ) کہ اسلام، نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا؟ تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز۔ روزہ۔ حج زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظام حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بہ حیثیت ایک نظام حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دلکش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ——— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب، مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنادے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اول:۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔ قیمت فی جلد ——— آٹھ روپے

قسم دوم:۔ مکینیکل پیپر۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد ——— چار روپے

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

رابطہ باہمی

—— بزم ہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں ——

لاہور

بزم پورے نظم و نسق اور ولولے سے سرگرم عمل ہے۔ ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہوتے ہیں اور اراکین بزم ان میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ ماہ دسمبر کے دوران میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں بزم کے زیر اہتمام دو اہم تقاریب سرانجام پائیں اور ان اجتماعات سے پرویز صاحب نے خطاب کیا۔

۶۔ دسمبر۔ اتوار کی صبح کو مذکورہ ہال میں "شب معراج" کی تقریب پر عظیم الشان پیمانے پر اجتماع ہوا۔ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ انہوں نے بڑے دلچسپ لفظوں اور موثر انداز میں مفکر قرآن کا تعارف کرایا۔ اور اس کے بعد محترم پرویز صاحب خطاب کے لئے سامنے آئے۔ ان کے خطاب کا موضوع تھا —— ع

کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

اور جب پرویز صاحب نے قرآن کی زبان میں یہ بتایا کہ "معراج کی رات" کس حسین انداز سے "مقام محمدی" کی نقاب کشائی کرتی ہے تو حاضرین پر وجد و کیف کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مفکر قرآن سورۂ والنجم کی آیات اپنے مخصوص حسن انداز سے حاضرین کے سامنے لا رہے تھے اور ان کے ساتھ انسانیت کی وہ معراج ابھر اور نکھر کر منظر عام پر آ رہی تھی جو حضورؐ رسالتمآب کے مقام نبوت سے تکمیل پذیر ہوئی۔

وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور ہال سے باہر جن نشستوں کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا وہ بھی وارفتگان شوق سے پُر تھیں۔ پرویز صاحب کے خطاب کے خاتمے پر جب سوالات کے لئے اعلان کیا گیا تو ہر طرف سے آوازیں سنائی دیں کہ اس قدر حقیقت کشا خطاب کے بعد کسی سوال کی گنجائش کہاں۔

۲۵- دسمبر کو قائداعظمؒ کے یوم ولادت کی تقریب تھی۔ بزم نے اس سلسلے میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں محترم پرویز صاحب کے خطاب کا انتظام کر رکھا تھا۔ محترم شیخ سراج الحق صاحب نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ محترم ظفر عباس صاحب نے تلاوت کلام پاک کی اور اس کے بعد تعارف کا فریضہ بڑے حسین انداز میں سرانجام دیا اور مرزا محمد خلیل صاحب نے کلام اقبالؒ سے شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان پیدا کیا۔ اس کے بعد پرویز صاحب مائیک کے سامنے آئے۔ ان کے خطاب کا عنوان تھا ۔۔ ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

قائداعظمؒ کی تاریخی عظمت اور زندہ جاوید کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ کن نازک حالات میں انہوں نے قوم کی عنانِ قیادت سنبھالی۔ کن منظم اور مضبوط دشمنوں سے انہیں نبرد آزما ہونا پڑا۔ خود گھر کے اندر کون کون سی قوتیں باہر کے ان دشمنوں کا ہراول دستہ بن کر ان کے خلاف میدان میں آئیں۔ اور انہوں نے اپنی عظمتِ کردار، حسنِ تدبر اور مومنانہ عزم و فراست سے انہیں شکست دے کر اس مملکتِ عظیم کے حصول و قیام میں کامیابی حاصل کی۔ اور یہی ایک شخصیت کی عظمت کا راز ہے کہ اس نے کن مشکلات و موانعات میں اپنے کام کا آغاز کیا اور اس کی رحلت کے بعد صورتِ حال میں کیا تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔

بزم کا آئندہ پروگرام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ۱۷ جنوری کو اس کے زیرِ اہتمام یومِ بدر منایا جا رہا ہے۔ یومِ بدر، مسلمانوں کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ تاریخِ انسانیت میں ایک فیصلہ کن ساعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس انقلاب آفریں واقعہ کی اہمیت سے قوم کو متعارف کرایا جائے۔ یہ تقریب اس مقصد کو پورا کرنے کی ابتدا ہے۔

۳۱ جنوری کو نزولِ قرآن کی تقریب میں ایک خصوصی اجتماع منعقد کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے بعد عید سے متصل حسبِ معمول جشنِ نزولِ قرآن اس عظیم تقریب کے شایانِ شان منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان مخلص سرگرم احباب کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے۔

کراچی

کراچی کی نئی بزم پوری گرمجوشی سے مصروفِ عمل ہے اور اپنی نسبتاً کم مائیگی کو خلوص، تدبر اور حسنِ عمل کی متاعِ گراں بہا سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ درس کا سلسلہ سندھ اسمبلی ہال میں جاری ہے اور سامعین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں لٹریچر کی تقسیم اور اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔ خدا ان کے ارادوں کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔

سرگودھا

بزم نے اپنے نئے نمائندہ کی سرکردگی میں پورے جوش و خروش سے آغاز کار کر دیا ہے۔ اراکین بزم جہاں شہر میں لٹریچر کی تقسیم سے نشر و اشاعت کا منظم سلسلہ قائم کئے ہوئے ہیں وہاں نمائندہ بزم کی قیادت میں ان کے تبلیغی وفد سرگودھا سے باہر دور دراز کے قصبوں اور دیہات میں پہنچکر بھی قرآنی فکر کی دعوت کو عام کر رہے ہیں اور ان مقامات پر تحریک کا لٹریچر بھی تقسیم کیا جا رہا ہے۔ چک ۱۹ جنوبی، موضع گوندل، موضع پیل اور قصبہ ساہیوال میں اراکین بزم کے دورے بڑے کامیاب رہے۔ ان مقامات کے اہل علم معززین نے بڑے ذوق و شوق سے تحریک کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا ہے اور اس کے نتائج بڑے خوش آئند ہونگے۔

مقامی بار کے چند وکلاء حضرات بھی بڑی دلچسپی سے تحریک کے لٹریچر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ چل کر وہ بزم کے دست و بازو ثابت ہونگے۔

طے کیا گیا ہے کہ بزم کے ہر اجلاس میں اراکین بزم باری باری اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کریں، بزم کا ٹیپ ریکارڈر مرمت طلب ہے۔ اس کی مرمت کے بعد بزم اس قابل ہو جائے گی کہ پرویز صاحب کا درس قرآن اور خطابات عوام تک ان کی اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پہنچائے جا سکیں۔

یاد دہانی

۵ جنوری کو تمام بزموں کے نام ایک گشتی مراسلہ بھیجا گیا تھا۔ جن بزموں نے ابھی تک اس کا جواب نہیں دیا انہیں یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ جواب سے کہیں زیادہ ضروری اس پروگرام پر عملدرآمد ہے جس کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

کراچی میں پرویز صاحب کا درس قرآن :- ہر اتوار کی صبح، نو بجے حسب معمول سندھ اسمبلی ہال میں بذریعہ ٹیپ شروع ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک درس ہو کر اس حقیقت کو سمجھئے کہ قرآن انسانی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل کا کسقدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی۔

لاہور میں پرویز صاحب کا درس قرآن :- ہر اتوار کی صبح، ساڑھے نو بجے ۲۵/ابی گلبرگ میں شروع ہوتا ہے۔ (نمائندہ بزم لاہور)

باب المراسلات

طلوع اسلام کا مسلک

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ لگے دنوں وائی ایم سی اے ہال پر تقریر کے بعد ایک سوال کے جواب میں پرویز صاحب نے کہا تھا کہ طلوع اسلام ہر اس بات کی مخالفت کرتا ہے جسے وہ قرآن کریم کے خلاف سمجھے اور ایسا کرنے میں اس کے پیش نظر شخصیتیں قطعاً نہیں ہوتیں۔ طلوع اسلام نے حالیہ الیکشن میں صدر ایوب خان صاحب کی حمایت کی ہے۔ کیا وہ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے جس میں اس نے کسی بات میں ان کی مخالفت بھی کی ہو۔

طلوع اسلام

اگر ہمارے یہ مستفسر طلوع اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تو انہیں ان کے سوال کا جواب اس کے اوراق میں خود بخود مل جاتا۔ ذرا اسی انتخاب کے سلسلہ ہی میں ایک اہم نکتہ پر غور فرمایئے۔ صدر محمد ایوب خان صاحب کی حمایت کرنے والوں نے اس بات پر بڑا زور دیا کہ اسلام کی رو سے عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی۔ اس سوال کو (مخالف اور موافق جماعتوں نے) اپنے اپنے ہاں اتنی اہمیت دی گویا یہی سوال انتخاب میں صدر ایوب یا محترمہ مس فاطمہ جناح کی کامیابی اور ناکامی کا معیار تھا۔ لیکن ایسے نازک مرحلہ میں اور ایسے اہم سوال کے متعلق طلوع اسلام نے واضح الفاظ میں لکھا کہ

> جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اسلام میں ایک عورت سربراہ مملکت بن سکتی ہے، تو قرآن کریم کی رو سے اس کا جواب مثبت (ہاں) میں ہے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق مرد اور عورت زندگی کے ہر گوشے میں دوش بدوش چلنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور (سوائے ان طبعی وظائف کے جن کا تعلق جنس سے ہے) مرد اور عورت میں کسی قسم کا امتیاز نہیں۔ لہٰذا سوال صرف ذاتی اہلیت کا ہونا چاہیئے۔ (طلوع اسلام۔ نومبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۲)

کیا اس کے بعد اس امر میں کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ طلوع اسلام ہمیشہ اس چیز کی مخالفت کرتا ہے جو قرآن کریم کے مخالف ہو اور ایسا کرنے میں شخصیتیں اس کی راہ میں روک نہیں بن سکتیں۔ اور یہ اس لئے کہ اسے کسی سے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید

ہوتی ہے۔ قرآنی تعلیم کو پیش کرنا۔ اور ہر خلاف قانون تصور، مسلک و مشرب کی مخالفت کرنا اس کی زندگی کا مقصد اور ایمان کا تقاضا ہے۔ مصلحتوں کی خاطر اصول بدلنا اور زندگی کی عملی ضروریات کیلئے جھوٹ بولنے کو واجب قرار دینا اس کا مسلک نہیں۔

۲- کیا عورت مملکت کی سربراہ ہو سکتی ہے؟

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ گزشتہ انتخاب میں، اس سوال نے کہ عورت مملکت کی سربراہ ہو سکتی ہے یا نہیں، جس قدر اہمیت اختیار کر لی اور اس کی وجہ سے جس قدر ہڑبونگ مچائی گئی، میں جب اس کا خیال کرتا ہوں تو عجیب پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس بحث میں عام طور پر سطح کس قدر پست تھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرات علمائے کرام (بلکہ ان کے ساتھ "روحانی پیشواؤں") کا ایک گروہ اس کے حق میں تھا اور اتنا ہی بڑا گروہ اس کے مخالف۔ ایک گروہ اسے عین مطابق شریعت قرار دے رہا تھا اور دوسرا گروہ اسے بالکل خلاف اسلام ثابت کر رہا تھا۔ اس سے مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ آپ جو شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اگر ملک کے قوانین نے اس طرح مرتب ہونا ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں، اور اس بات کا فیصلہ علمائے کرام نے کرنا ہے تو قیامت تک کوئی قانون مرتب ہی نہیں ہو سکے گا، وہ بات کس قدر صحیح ہے۔ کل کو اگر اسی بات نے قانون کی شکل اختیار کرنی ہو کہ عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے یا نہیں تو سوچئے کہ ان علماء حضرات کی طرف سے اس کا کوئی فیصلہ بھی ہو سکے گا؟ اگر حکومت نے یہ قانون بنا دیا کہ ایسا ہو سکتا ہے تو علماء صاحبان کا ایک گروہ اسے خلاف اسلام قرار دے کر ملک میں ہڑبونگ مچا دے گا۔ اور اگر حکومت نے اس کے خلاف قانون بنا دیا تو علماء کا دوسرا گروہ اس کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دے گا۔ اس کھینچا تانی میں ملک اور اس بدقسمت قوم کا جو حشر ہو گا وہ ظاہر ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ قرآن شریعت کی رو سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے اس لئے عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے۔ بات تو اتنی بھی واضح ہے لیکن اگر آپ قرآن شریف کی روشنی میں اس کی مزید وضاحت فرما دیں تو یہ ہمارے لئے مزید اطمینان کا باعث ہو جائے گا۔

طلوع اسلام

یہ حقیقت کہ ان فطری وظائف کے علاوہ جن میں مرد اور عورت میں فرق ہے، قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں میں زندگی کے کسی گوشے میں کوئی تفریق نہیں کی، ہم طلوع اسلام کے صفحات میں بار بار واضح کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں ذرا اس اصولی نقطہ پر غور فرمائیے۔ قرآن کریم کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ایسا نظریہ یا نظام جس میں محض پیدائش کے فرق کی بنا پر کسی انسان کے راستے میں دیوار کھڑی کر دی جائے کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا، غیر اسلامی تصور یا نظام ہو گا۔ اس اصول کے

مطابق آپ سوچئے کہ انسانوں کی آدھی صنف کے متعلق یہ فیصلہ کر دینا کہ وہ محض پیدائش کے فرق کی بنا پر دوسری صنف کے برابر نہیں ہو سکتی، کس قدر قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہوگا؟ آپ قرآن کریم کی متعدد آیات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کس طرح زندگی کی ہر شاہراہ پر مرد اور عورت شانہ بشانہ چلتے دکھائی دیتے ہیں اور کسی مقام پر بھی ایسا نظر نہیں آئے گا کہ وہاں پھاٹک لگا دیا گیا ہو جس پر لکھا ہو کہ اس سے آگے مرد تو جا سکتے ہیں، عورتیں نہیں جا سکتیں۔ مثلاً سورۂ احزاب کی آیت صفحہ ۳۵ کو دیکھئے (یعنی ۲۳/۳۵ کو) جس کی ابتدا "ان المسلمین والمسلمٰت ....." سے ہوتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وہ کونسی انسانی خصوصیت ہے جس میں عورتوں اور مردوں کو برابر کا شریک نہیں بتایا گیا؟ سو جب عورتوں میں ان تمام خصوصیات اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا ممکن ہے جو مردوں میں پیدا ہو سکتی ہیں تو وہ کونسا گوشۂ زندگی ایسا ہو سکتا ہے جس کے متعلق کہا جائے کہ مرد تو اس کے اہل ہیں لیکن عورتیں اس کی اہل نہیں ہو سکتیں؟

اب آپ خصوصیت کے ساتھ امورِ مملکت کی طرف آئیے۔ سورۂ حج میں، امتِ مسلمہ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

> جب ان کی حکومت قائم ہو گی تو یہ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ اور .... امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔ (۲۲/۴۱)

یعنی "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ بلکہ مقصد ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس فریضہ کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیا ہے یا اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (۹/۷۱)۔ یہ مرد اور عورتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم کی ایسی واضح شہادت کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ "مرد اور عورتیں" دونوں، امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے اہل ہیں اور ان میں شریک ہو سکتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اس کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ عورتیں پیدائش کے اعتبار سے امورِ مملکت میں حصہ لینے کی اہل ہی نہیں۔ خدا نے انہیں اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کیا۔ کس قدر قرآن کی تکذیب ہے! ایسا کہنے والوں کو اپنے کئے کی سزا کس طرح سے ملتی ہے، اس کی تازہ شہادت مودودی صاحب کا انجام ہے وہ ۱۹۶۱ء تک پورے وثوق سے کہتے رہے کہ خدا نے عورت کو امورِ سیاست میں حصہ لینے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا۔ اور ۱۹۶۲ء میں انہیں خود ہی یہ کہنا پڑا کہ عورت خلقی طور پر ایسی نہیں کہ وہ امورِ مملکت میں حصہ لینے کی اہل نہ ہو۔ اگر وہ شروع ہی سے قرآن کو

اپنا راہ نما اور حکم مانتے تو وہ اس قسم کی قلابازیوں کی ذلت سے بچ جاتے۔ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱)۔ جو شخص خدا کے ساتھ اوروں کو بھی قانون سازی اور اصول دہی کے اقتدار میں شریک کرتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا اور اُسے پرندے یوں اچک کر لے گئے (جس طرح چڑیا کے اُس بچے کو جو اپنے گھونسلے سے گر پڑے، چیل یا اور کوئے جھپٹ کر لے جاتے ہیں) یا اس پر کاہ کی سی جسے) ہوا کا تیز جھونکا اس کے مقام سے اٹھا کر کہیں دور دراز (ویرانوں میں) پھینک دے۔

عورتوں کو مردوں سے پست قرار دینے والے، اپنے نظریہ کی دلیل میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ..... (۴/۳۴)۔ اور اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "مرد عورتوں کے سربراہ - یا داروغہ یا حاکم ہیں"۔ آپ قرآن کریم کی ساری تعلیم کو سامنے رکھئے جو اس نے عورتوں اور مردوں کے سلسلہ میں دی ہے اور پھر سوچئے کہ یہ مفہوم اُس تعلیم میں کسی طرح بھی فٹ بیٹھتا ہے؟ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ دیدے — کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کے علاوہ میرے محکوم بن جاؤ..." (۳/۷۹)۔ آپ سوچئے کہ جو قرآن، نبی تک کو بھی اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے، کیا وہ یہ اصول بیان کرے گا کہ انسانوں کی آدھی آبادی (مردوں) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ دوسری نصف آبادی (یعنی عورتوں) پر حاکم اور داروغہ بن کر بیٹھ جائے؟ اور اس محکوم طبقہ کی حالت یہ ہو کہ وہ اس محکومیت کے شکنجے سے کبھی نکل ہی نہ سکے۔ اس لئے کہ جب عورت کا نصف عورت ہونا اسے مرد کا محکوم بنا دے گا تو وہ اس کی محکومیت کے آہنی پنجے سے نکل کیسے سکے گی؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ دستور قرآن کا نازل کرنے والا خدا اس قسم کی تعلیم دے گا؟ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

قَوَّامٌ کے معنی ہیں سامان رزق مہیا کرنے والا۔ قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَةَ وَ قَامَ عَلَيْهَا کے معنی ہیں مرد نے عورت کی کفالت کی۔ اس کی ضروریات کو پورا کیا۔ (دیکھئے عربی زبان کی مستند لغت، تاج العروس)۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ گھر کی زندگی میں تقسیم کار کی رُو سے عورتوں کا بیشتر وقت اولاد کی پیدائش و پرورش میں صرف ہو جاتا ہے اور مرد ان فرائض سے فارغ ہوتے ہیں اس لئے کسب معاش کرتے ہیں۔ اس بنا پر بیوی کی کفالت خاوند کے ذمے ہوتی ہے۔ خاوند اس سے یہ نہ سمجھے کہ وہ بیوی پر بڑا احسان کر رہا ہے، کہ وہ کماتا ہے اور یہ "مفت میں کھاتی ہے"۔ اس لئے اُسے (مرد کو) عورت پر فوقیت اور افضلیت حاصل ہے اور وہ (عورت) اس کی دست نگر ہونے کی وجہ سے اس کی محکوم ہے۔ غور کیجئے۔ قرآن نے جس ذہنیت کو ختم کرنے کے لئے یہ آیت نازل کی تھی، ہمارے ہاں اسی آیت کو، اُس ذہنیت کو پیدا کرنے اور محکم بنانے کے لئے پیش کیا جاتا ہے؟ کیا

قرآن کریم کا اس سے زیادہ غلط استعمال کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اس تقسیم کار کے یہ معنی نہیں کہ عورت گھر سے باہر کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ تو خاندانی زندگی کا ایک عمومی نقشہ ہے ورنہ، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عورت وہ سب کچھ کر سکنے کی اہل ہے جو مرد کر سکتے ہیں۔ نہ ہی اس قوامیت کے یہ معنی ہیں کہ عورت اکتساب معاش نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم میں بصراحت موجود ہے کہ مرد جو کچھ کمائے وہ اس کا حصہ ہے اور عورت جو کچھ کمائے وہ اس کا حصہ۔

اس مقام پر ہم اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتے۔ اگر آپ قرآن کریم کی رُو سے عورت کے صحیح مقام کے سلسلہ میں مزید وضاحت چاہتے ہوں، تو ادارہ کی طرف سے حال ہی میں شائع کردہ کتاب - سلام علیک - میں عورت سے متعلق عنوان ملاحظہ فرمائیے۔

کیا آپ کو اتنی فرصت ہے

کہ آپ گزشتہ اڑھائی ہزار سال کے مختلف، مفکرین۔ مورخین۔ سیاسی مدبرین۔ مذہبی مصنفین اور نامور سائنسدانوں کے خیالات کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ ان سب کا رجحان کس طرف ہے؟

آپ کو فرصت نہیں ہو سکتی

آپ کے لئے یہ کام اس معرکہ آرا کتاب نے کر دیا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتی اس کتاب نے اتنا ہی نہیں کیا کہ دنیا بھر کے ائمہ فکر و نظر کے خیالات یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی عقل کس طرح خدا کی وحی کی محتاج ہے۔ اس عجیب و غریب کتاب کا نام ہے۔

انسان نے کیا سوچا؟

ضخیم کتاب۔ سفید کاغذ۔ ٹائپ کی طباعت حسین اور پائیدار جلد۔ قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی — گلبرگ - لاہور

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر
(طلوع اسلام کنونشن کی تقریب)

آپ بیتی

ایسی محفل میں جہاں اتنے سارے پڑھے لکھے لوگ ہوں مجھ ایسے شخص کا خطاب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن ایسی ہی محفل میں تو بات کہنے کا لطف رہتا ہے

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ دے
پھر التفات دلِ دوستاں رہے نہ رہے

ڈاکٹری پیشہ سہی، لیکن داستان گوئی ——— افسانہ نویسی ——— بھی ایک مدت سے ساتھی ہے اور اسی کا سہارا لے کر آج یہ نیا افسانہ، ہو آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی کہنے لگا ہوں ———

مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہر بچے کی طرح خدا کی کتاب بچپن ہی میں ایک حافظ صاحب سے پڑھی۔ بالکل جیسے عام مسلمان پڑھتے ہیں (اب تو خیر سے یہ رسم بھی متروک ہو رہی ہے) نہ کسی نے سمجھانے کی ضرورت اور اہمیت بھی اور نہ ہی خود اپنی سمجھ ایسی تھی کہ اس کی ضرورت محسوس کرتے، اور پھر دیکھا یہی کچھ تھا کہ گھر کے افراد عام طور سے کبھی کبھی مگر رمضان میں ہر فرد روزانہ اور اکثر وقت اس کی تلاوت کرتا اور زیادہ سے زیادہ بار رمضان میں، ختم کرنے کی کوشش کرتا کہ اس مہینے بہت ثواب ملتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی ثواب حاصل کرتے رہے۔ پیکو آرٹ اور تاج کمپنی کے خوبصورت پیپارے چوم کر اٹھاتے۔ ہل ہل کر پڑھتے اور چوم کر جزدان میں بند کر دیتے۔

سکول کا زمانہ گزرا۔ کالج شروع ہوا۔ ہندو، سکھ، سب قومیں ساتھ تھیں۔ سوچ بیدار ہوئی۔ اسلام سب سے اچھا مذہب ہے تو یہ سب لوگ کیوں اسلام اختیار نہیں کر لیتے۔ ان میں بھی بڑے پڑھے لکھے لوگ ہیں، وہ کیوں اس کی خوبیاں نہیں دیکھ سکتے۔

وہ کیوں اس کی تعلیم سے بے خبر ہیں۔ اس کی تعلیم کیا ہے ـــ سچ بولنا، نیکی کرنا، غریبوں کی مدد کرنا، دکھیاؤں کے دکھ کا مداوا کرنا، خیرات ـــ یہ سب تو وہ لوگ بھی کرتے ہیں۔ اس کے تو وہ بھی قائل ہیں اور اپنے مذہب ہی کی تعلیم کی وجہ سے ـــ پھر مذاہب میں فرق کیا ہے ـــ ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی تو پرارتھنا کر ہی لیتے ہیں۔ رام اور کرشن بھی تو پیغمبر ہوں گے، بدھ بھی پیغمبر ہو سکتے ہیں۔ خود خدا ہی نے تو کہا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو سیدھے رستے پر چلائیں ـــ وہ لوگ بھی خدائی تعلیم پر کاربند ہیں۔ پھر ان کی ساری نیکیاں، ان کی خیرات، ان کی سخاوت، ان کے بھلائی کے کام، یہ سب کیوں ضائع جائیں گے ـــ بڑے اطمینان اور بڑے فخر سے ہم سوچتے تھے کہ جنت میں تو ہم ہی جائیں گے کیونکہ خدا نے خود کہا ہے کہ اسے دین اسلام پسند ہے۔ پھر سوچ آتی، مگر جو لوگ ہمارے نبی سے پہلے پیدا ہو چکے، عیسائی اور یہودی، بدھ یا ہندو ہو گئے، ان کا کیا قصور۔ بات سمجھ نہ آتی تھی۔ قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کی تو آگے نہ بڑھ سکے۔ کچھ اس قسم کے تراجم تھے کہ فقرہ ہی پورا نہ پڑھا جاتا تھا ـــ کسی بزرگ سے پوچھتے تو تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ مولوی صاحب بھی نیکی اور ثواب اور آخرت کے آگے کچھ نہ سمجھا سکتے اور ساتھی بھی یہیں تک پہنچ پاتے کہ بھئی اپنے نماز روزے سے مطلب رکھو، باقی عالم لوگوں کا کام ہے۔ نیکی کرو، نماز روزہ کے پابند رہو ـــ نماز کمیٹیوں میں شامل ہو کر شہر کے چکر بھی لگائے ـــ مگر دل مطمئن نہ ہوا۔ اس سے کیا حاصل؟ نیکیاں، سچائیاں ہر مذہب میں یکساں ہیں تو پھر یہ تقسیم کیوں؟ کیا مذاہب بھی انسانوں کو تقسیم کرنے کے آئے تھے۔ پھر عالمگیر برادری کیسے انسان اور انسان کی تفریق کیوں؟ انسان کی نجات اسی میں نہیں کہ وہ سب امتیازات ختم کرے، سب تقسیم کرنے والے خطوط کو مٹا دے۔ سب مذاہب میں سچائیاں ایک سی ہیں تو سب مذاہب ایک کیوں نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو کیا ہو بھی نہیں سکتے؟

اس سب کے باوجود اسی میں خوش تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور خدا کے فضل سے سُنّی مسلمان (جو ہم سمجھتے تھے کہ سب سے اعلیٰ قسم کا مسلمان ہوتا ہے)۔ اپنے رشتہ داروں میں وہابی بھی دیکھے، سوائے اس کے کہ وہ نمازوں میں ہاتھ اٹھاتے اور آمین زور سے کہتے تھے اور کوئی فرق نظر نہ آیا۔ اور یہ فرق کوئی ایسا نمایاں فرق نہ تھا۔

کانگریس کی آزادی کی تحریک سامنے تھی۔ نیشنلزم کا زور تھا۔ جو دیہی کے عالم تھے وہ کانگریس کے ساتھ تھے۔ سوشلزم کی تحریک اپنی جگہ تھی اور کمیونزم طالب علم لوگوں میں تقریباً ایک فیشن تھا۔ خاص طور پر آزاد خیال قسم کے لوگوں میں ـــ ان لوگوں کی اپنی کلبیں تھیں، اپنا لٹریچر تھا ـــ اونچ نیچ کو ختم کرنے کا دعوے اور پروگرام تھا، مساوات کا نعرہ تھا ـــ یہ بھی اچھی ہی باتیں ہیں، مگر یہ لوگ خدا کو نہیں مانتے ـــ مگر پھر وہ جو کہتا ہے "منکر اور اگر شوی منکر خوشتن مشر" وہ ایسا کیوں کہتا ہے۔ وہ کمیونزم کے بابا کو "کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب" کیوں کہتا ہے ـــ وہ کمیونسٹ تو نہیں۔ اسلام نے اس مسئلے کا کیا حل دیا؟ اسلام کیا کہتا ہے؟ اسلام نے کیسے یہ تفرقات مٹائے ہیں۔ مگر مسلمان تو ایک طرف کھوکھا کے مالک تھے اور دوسری طرف غریب جو قطاریں باندھے امرا کے گزرنے کا انتظار کرتے تھے۔ مسلمان سلاطین ہیروں

میں لدے پھرتے تھے اور رعایا! اور پھر یہ غریبوں کو غربت پر قانع کرنے کے لئے جو آخرت کا منکر ہے جسے علماء اٹھائے پھرتے ہیں کہ اس دنیا کی دولتوں کا کیا ہے۔ یہ چند روزہ ہے۔ اگلی دنیا میں تو یہ سب کچھ انہی کو ملے گا۔ مسلمان آزادی وطن میں علیحدہ کیوں ہیں وہ مل کر جدوجہد کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ عالم لوگ کیوں کانگریس کے ساتھ ہیں۔ کیا یہ دین کو نہیں سمجھتے۔ یہ نہیں سمجھتے تو کون سمجھ سکتا ہے! یہ تو دین پر اتھارٹی ہیں ____ لیکن اگر دین یہی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی ہے تو کون اس راہ میں حائل ہے۔ انگریز کے عہد میں بھی اس کی آزادی حاصل تھی۔ مگر یہ آواز کیا کہتی ہے

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کیسے آزاد ہوتا ہے۔ اسلام کی آزادی کا کیا مطلب ہے اور پھر اسلام اور غلامی! یہ کانٹا بری طرح ذہن میں چبھتا۔ اسلام نے مظلوموں کا ساتھ دیا۔ انسانیت کو اس کا اصل مقام دلایا۔ عورتوں کو ان کے حقوق دلوائے، بچپن ہی سے ہمارے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ اسلام سے پہلے عورتوں کی حالت بڑی بری تھی۔ عرب بچیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ مگر یہ اسلام کے بعد غلام اور لونڈی کا جواز؟ اگر یہی وہ آزادی تھی۔ اگر یہی وہ حقوق تھے جو اسلام نے دلوائے تو کیا یہ بات ایسی ہے کہ ہم فخر سے سر بلند کر کے اسلام کی خوبیاں گنوا سکیں۔ یہ ابھی دنوں کی بات ہے کہ ہم نے کورس میں ابراہیم لنکن کی کہانی پڑھی تھی۔ غلامی کو دور کرنے کے لئے اس کی جدوجہد اور قربانی کا تاثر دلوں پر تازہ تازہ تھا کالج میں ایک سوسائٹی تھی جس میں ہندو، سکھ، مسیحی لوگ شامل ہوتے تھے۔ مختلف مذاہب کا کوئی مقرر ہوتا تھا اور پھر سب اس سے سوال کرتے تھے ایک بار اس میں ایک علامہ صاحب تشریف لائے۔ سوالات کے وقت یہی غلام اور لونڈی کے مسئلے کی، سوال کی صورت میں، میں نے وضاحت چاہی۔ انہوں نے بہت جواز پیش کئے، بڑی دلیلیں دینے کی کوشش کی اور وہی دلیلیں بعد میں میں نے ایک اور بزرگ کی کتاب میں دیکھیں ____ مگر دل کو تسلی نہ ہوئی۔ جب ایک آدمی کو، ایک انسان کو غلام بنا کر آپ بیچ سکتے ہیں۔ جب ایک عورت کو بغیر اس کی مرضی کے ایک جنس کے طور پر آپ اپنے تصرف میں رکھ سکتے ہیں، تو آپ نے انسانیت کا سر کسی طرح بلند نہیں کیا۔ اس کے جواز میں آپ لاکھ فلسفے لائیں، ذہن مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہ بات کہ واقعی ابھی تک صرف مسلمان ممالک ہی ایسے تھے جن میں غلام ملتے ہیں، جہاں عورتوں کی فروخت کی منڈیاں لگتی ہیں اور وہاں کے بھی ایسے جو شرعی نظام کے دعویدار ہیں، اس بات کو تقویت دیتی تھی کہ واقعی اسلام میں اس کا جواز ہے۔

نہ غریب کو روزی اور روٹی کے مواقع فراہم کئے، نہ سماجی انصاف کی ضمانت دی۔ خیرات سے خود داری کو مجروح اور قوت عمل کو شل کر دیا۔ انسانیت کو غلام اور لونڈی کے چکر سے نہ نکالا ____ تو پھر آخر مذہب نے دیا کیا

مومن کو فقط وعدۂ حورا

اس پراگندگی اور پریشانگی میں گھرا ہوا ذہن اور کچھ نہیں تو مذہب سے دل برداشتہ اور بیگانہ ہو جائے تو اسے آپ ملعون نہیں کر سکتے

میں بھی ایسے ہی تھا۔ مجھ سے اور بہت ایسے ہوں گے جو اسلام سے دلی وابستگی اور پیار کے باوجود اپنی کم علمی کی بنا پر اس سے مطمئن نہ تھے۔ کہ ایک طرف سے دفعتاً اسے روشنی کی کرن نظر آئی۔ کتابوں میں ایک کتاب ان کی نظر سے گزری۔ مسئلوں پر نظر ڈالی تو غلام اور لونڈی کے باب پر نظر رک گئی۔ اور وہ باب پڑھا تو حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آ گئی کہ اسلام نے تو یہ باب ہی بند کر دیا۔ وہاں تو اس بات کا ذکر ہی نہیں۔ پھر یہ باتیں مذہب میں داخل کیسے ہو گئیں۔ چور دروازوں سے یہ نقب زنی کس نے کی۔ اور جب اس نقب زنی کی کھوج میں نکلے تو بس وہی بات نکلی۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مقدس کتابوں اور معتبر تاریخی کتابوں میں جو خلفائے راشدین کی تصویریں ملتی ہیں وہ ان سے برگشتہ کرنے کو کافی ہیں۔

پاکستان بنا، اور مذہب پرست طبقے کی مخالفت کے باوجود بنا اور جو اس کے خلاف تھے۔ وہ بھی اس میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے وقت (جسے ہم اب تک ملک کا بٹوارہ کہہ کر اپنی ساری جدوجہد کا منہ چڑاتے ہیں) جو قربانی اس قوم نے دی۔ لاکھوں جانوں کی قربانی بے حساب مال و اسباب کی قربانی اور ہزاروں عصمتوں کی قربانی ——— اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت ——— یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں، اپنا مال، اپنی اولاد، اپنا سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور سب کچھ دے کر خوش ہیں۔

میرا خیال تھا کہ یہ مملکت دنیا میں عجیب ترین مملکت ہو گی جو ایک دین کی سربلندی کے لئے حاصل کی گئی ہے۔ یہ دنیا میں قومیت کی ایک نئی تعریف دے گی ——— وہ اس پرانے خیال کو باطل قرار دے گی "کہ ملت از وطن است" یہ نئی تعریف کیا ہو گی۔ یہی کہ قومیں جغرافیائی حدود، نسل و رنگ کی وجہ سے نہیں، ایقان و ایمان، وحدتِ فکر و نظر، مشترک منتہائے حیات کے طفیل وجود میں آتی ہیں یہ ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یہاں ہر کام اس نظریے کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔

مخالف اس ملک کے وجود میں آنے سے پہلے ڈراتے تھے کہ یہ بڑی سخت گیر مملکت ہو گی جہاں حکومت کے کارندے کوڑے لئے پھرتے ہوں گے۔ ذرا ذرا سی لغزش پر کوڑوں سے کھال ادھیڑی جائے گی چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے، زانی کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ تو ایک طرف خلیل جبران کے مقدس شہر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا جہاں کسی کا ہاتھ کٹا ہوا تھا، کسی کی آنکھ، کسی کا کان ——— اور دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ سے منسوب وہ بات یاد آ جاتی کہ، پتھر تو اس گناہگار کو ضرور مارو کہ یہی اس کی سزا ہے مگر پہلا پتھر وہ اٹھائے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو ——— وکٹر ہیوگو کا لامزرابل کا ہیرو سامنے آتا کہ بھوک سے مجبور ہو کر روٹی چراتا ہے اور ۲۰ سال کی جیل کی سزا سہتا ——— اگر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا، تو کیا انصاف کا تقاضا یہی ہے؟ پھر کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ قحط کے دنوں

میں یہ سزا حضرت عمرؓ نے کھانے کی چیزوں کی چوری کے سے ہٹا دی تھی ۔

بھوک سے مجبور ہو کر، حالات سے تنگ آکر ۔ یہ حالات کون بناتا ہے ، یہ معاشرے کے اصول، اس کی بندشیں کون بناتا ہے ۔ اور پھر روزی کے ذرائع اور رزق کی تقسیم کا ذمہ دار کون ہے ؟ خدا سب کی روزی کا ذمہ اٹھاتا ہے تو لوگ بھوکوں کیوں مرتے ہیں، فاقوں سے تنگ آکر چوری کیوں کرتے ہیں ؟

اسلام میں معاشی نظام کیا ہوگا کیا صحیح نہیج اسی طرح قائم رہے گی کہ ایک طرف دولت اور ذرائع آمدنی کی فراوانی ، کوٹھیاں ، بلڈنگیں ، کارخانے ، تجارت، زمین اور دوسری طرف بدحالی ، فاقہ کشی ، محرومی ۔ اور پھر اس سب پر مطمئن کرنے کے لئے یہ فلسفہ کہ قسمت پہلے ہی سے لکھی ہوئی ہے ۔ چلو یہاں نہیں تو اگلے جہاں میں سب کچھ ملے گا ۔ اس لئے کوئی جدوجہد (STRUGGLE) نہ کرو ۔ وہ جس کو خدا دیتا ہے اس کو کون محروم کر سکتا ہے ۔

معاشی نظام کے متعلق کسی سے سوال کیا جاتا تو ایک ہی (INSTITUTION) کی طرف سب کا اشارہ ہوتا ۔ ڈھائی فیصد زکوٰۃ ۔ کیا یہ حکومت کی طرف سے ٹیکس ہوگا ؟ ورنہ لوگ کیوں از خود اپنی دولت دوسروں کو دیں گے ۔ کون اس ایمانداری پر مجبور کرے گا ۔ ذہن سوچتا ، اس سے کیا سب مسئلہ حل ہو جائے گا ۔ معاشی خوشحالی اور فارغ البالی ہو جائے گی ۔ اور اگر نہیں ہوگا تو وہ بستی کیسے بسے گی جس کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ اس پر اس کا انعام ہوا ۔ وہ بستی جہاں رزق کی فراوانی ہوگی ۔ ہر شخص مطمئن ہوگا ۔ نہ حزن ہوگا نہ یاس اور نہ خوف (فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) جہاں مسرت و اطمینان کی زم زمِ روا ، سبک خرام ، نہریں جاری ہوں گی ۔ قلب و نظر کو زندگی دینے والی سرسبز فضا ہوگی ۔ ہر شخص ایک دوسرے کا ساتھی اور مددگار ہوگا ۔ ایک دوسرے کو اس کی کمیاں پوری کرنے میں مدد دے کر اس کا اصل مقام پانے میں معاون ہوگا ۔ ایسا کب ہوگا ؟ امید لگائے بیٹھے رہے کہ ایسا ہوگا ۔ حکومت والے ابھی اور کاموں میں الجھے ہوئے ہیں ۔ نیا دستور بنے گا ، نئے قانون بنیں گے ، اور " یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی !!

سیاسی قلابازیوں اور چالوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا اگرچہ یہ باتیں بھی غیر متعلق نہیں کیونکہ یہ سوچ سکنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتی تھیں کہ یہاں بھی میکاوؔلی کی سیاست کی کتاب چلے گی ؟ یہاں کوئی نیا معیار ، نئی روایات (TRADITIONS) نہ قائم کی جائیں گی ؟ اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے جس پر ہماری مملکت کا دستور بنے گا ۔ یہاں جمہوریت ہوگی یا آمریت ؟ جیسے یہاں معاشی نظام کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ نہ تھا ، سیاسی نقشے کی بھی کوئی واضح صورت نہ تھی کوئی کہتا اسلام میں جمہوریت ہے ۔ " وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ " کا ارشاد اسی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ ڈکٹیٹر شپ چونکہ فری ورلڈ کے فیشن ایبل نظریات کے خلاف ہے اس لئے یہ احسن نہیں ہو سکتی ۔ پھر جمہوریت کا نقشہ وہی مغربی جمہوریت سامنے تھا جہاں ۵۱ فیصد کی رائے بہر حال درست اور صائب اور ۴۹ فیصد غلط اور باطل ۔ وہ جمہوریت ، پارٹی بازی جس کا لازم جزو تھا ۔

"عوام کی بہبود کے لئے عوام کی اپنی حکومت" دل خوش کن نعرے تھے، مگر اب کچھ کچھ قرآن سمجھنا شروع کر دیا تھا، وہاں جب ارشاد ہوا کہ فرعون کی سیاست یہ تھی کہ لوگوں میں جماعتیں پیدا کر دیتا اور ان کی آویزش پر اپنی سیادت قائم کرتا تو پارٹی بازی کا وجود اسلام میں ممکن نظر نہ آتا۔ وہ تو تمام امت کو ایک جماعت سمجھتا ہے۔ اس میں افتراق اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اُسے یہ اسلام کی راہ سے پھر جانے والوں کی راہ بتاتا ہے۔ مگر ہمارے پہلے دستور نے جب فرقوں کو تسلیم کر کے ہر فرقے کو اس کے پرسنل لاز کی گارنٹی دی تو سوچ آئی کہ یہ کیا ہوا۔ ایمان لانے کے بعد فرقوں اور گروہوں میں بٹنے پر مہرِ تصدیق کیسے قبول کر لی جائے، اور وہ جو اسلام کے مفتی اور اس کے عالم کہلاتے ہیں سب اس پر خوش نظر آتے ہیں کیا یہ سب کہیں اس لئے تو نہیں کہ اس سے ان کی اپنی گروہی سیادت قائم رہتی ہے! ہر بات کا فیصلہ اللہ سے لیا جائے گا۔ وہ جو خالق و مخلوق میں پردے حائل کرتے ہیں بلکہ خود پردے بن کر حائل ہیں ان پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے پھر کون اُٹھا سکے گا۔

مگر ہماری قومی زندگی میں ایک ۔۔۔ دتے کی وجہ سے یہ دستور نہ چل سکا (میں نے انقلاب کیسے کہوں، کہ انقلاب تو انسانوں کے قلوب کو بدل دیتا ہے۔ وہ تو سوچ کا رُخ تبدیل کر دیتا ہے) اور نئے لوگوں نے کچھ نئے راستے تلاش کرنے چاہے کچھ اصلاحات شروع کیں۔ مگر جب معاشی میدان میں ترقی کے سلسلے میں یہ سنا کہ، نفع کا جذبہ محرکہ (INCENTIVE) منافع کا لالچ نہ ہو تو انسان کام کیسے کریں گے۔ شعیب صاحب کی اس بات پر قوم شعیبؑ کی وہ بات یاد آ گئی کہ اے شعیبؑ کیا تری صلوٰۃ تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے کاروبار کا ڈھنگ بدل دیں؟ (اسلام) جو قلوب کی اصلاح کرتا ہے، اس کی طرف قدم نہ اٹھائے جائیں، تو یہی مادی معیار باقی رہ جاتے ہیں۔

اور پھر دل کو بہت دکھ ہوا جب یہ دیکھا کہ درگاہوں سے مجاوروں کو ہٹا کر حکومت خود مجاور بن بیٹھی۔ ان رسوم کو جنہیں ہم مجاوروں کی جہالت اور شخصی حرص کا نام دے کر چشم پوشی (IGNORE) کر سکتے تھے اب ایک مسلمان حکومت کی طرف سے باقاعدہ مستند قرار پا گئیں ۔۔ اور اب دل کو اس بات کے لئے بھی مضبوط کر رہا ہوں کہ کسی دن یہ سن لوں کہ عائلی قوانین کا نفاذ جو درست سمت میں ایک جرأت مندانہ قدم تھا، جمہوری خوشنودی کی خاطر واپس لے لیا گیا کیونکہ یہاں ہر بات عوام کے ووٹ سے درست قرار پاتی ہے، اور نے حکمرانوں کو بھی اقتدار کی خاطر عوام کی دہلیز پر جبیں خم کرنی ہے۔ اور سب خاموش ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے اقدام کی صحت اور اس کے درست ہونے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ورنہ وہ دوسروں کو سمجھا تو سکتے تھے۔ ان کے پاس سمجھانے کے ذرائع بھی تھے۔

یہ رجعت قہقری دیکھ کر دل ڈول اٹھتا ہے کہ شاید ہم وہ سب بھول بیٹھے ہیں جو ہم مملکت حاصل کرتے وقت کہا کرتے تھے۔ شاید ہم نے ایک طرف مُلائیت اور دوسری طرف لادینی جمہوریت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

کوئی واضح نظام سامنے نہ ہونے، کوئی مخصوص آئیڈیل پیشِ نظر نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں، اور مادی ترقی کے پیشِ نظر، جسم کی آسودگیوں اور ذہن کی آوارگیوں کی راہوں پر چل رہے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل

مغرب کی بظاہر خوشحالی اور ترقی کی چمک سے چکا چوند ہو کر دیوانہ وار، اس کی نقالی میں، ان سے بھی آگے بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمیں، کارٹون بنے نوجوان، اور جسم کے خطوط کی نمائش بلکہ اشتہار بنی دوشیزائیں نظر آتی ہیں جو کل تک ایوس پریسلے کی تصویریں جیب میں لئے پھرتی تھیں اور اب بٹلز کے لباس کی دھجیاں تبرک سمجھ کر اڑا لینے میں فخر محسوس کرتی ہیں ——

یہ ہماری نئی نسل کا حال ہے جس پہ ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ پرانی نسل کی بات ہوتی تو ہم صبر کر لیتے۔ حضرت موسےٰ نے بھی تو پرانی نسل کو اس کے حال پر چھوڑ کر اپنی توجہ نئی نسل کی تربیت پر مرکوز کر دی تھی اور چالیس سال جنگلوں میں رہے تھے اور انہی بے برگ و گیاہ صحراؤں میں جہاں کوئی سہولت میسر نہ تھی، نئی نسل کو ایسی تربیت دی۔ انہیں خود اعتمادی اور مقصد پر یقین اور عزت و سیادت اور رنگ و بو سے اس قابل بنا دیا کہ جب وہ دوبارہ غیر خدائی طاقتوں کے مقابل آئے تو ہر فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔ کسی قارون کے لالچ میں نہ آئے اور کسی ہامان کے نظر فریب جال میں اسیر نہ ہو سکے۔

ہمیں بھی یہی کام کرنا ہوگا۔ شروع ہی سے انہیں ایسی تربیت اور تعلیم دینا ہوگی کہ وہ خود زندگی کی حقیقتوں کو سمجھیں ان پر غور کریں۔ انہیں قرآن کی تعلیم دیں کہ وہ ہر بات کو، ہر صورت حال میں، اس کی روشنی میں پرکھ سکیں۔ وہ اپنی پابندیوں کو بھی سمجھیں اور اپنی آزادیوں کو بھی پہنچانیں۔ آج ہم وہ نظام رائج نہیں کر سکے تو کم از کم وہ ذہن تو پیدا کرتے جائیں جو کل ہمارے بعد اس کے اہل ہوں۔ سارے ملک میں ایک ایسا طبقہ تو ہو جو اس کی مثال بن سکے۔ ایک تو ایسی درسگاہ ہو جو دینی اور دنیوی تعلیم کی دو عملی میں منقسم نہ ہو۔ جہاں کے طالب علم ایک ہی نظری سے ایک ہی جذبے سے سب علوم حاصل کریں۔ ان کے پیش نظر ایک مقصد ہو اور اس مقصد کی خاطر وہ ہر علم کے حصول کو دینی فریضہ کا درجہ دیں اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کبھی اس راہ سے نہ بھٹکیں —— اسلام میں شامل ہونا، اپنے آپ کو مسلمان کہنا، دراصل ایک عہد ہے کہ ہم خدا کے بتلائے ہوئے اصولوں کو ہر قدم پر مدنظر رکھ کر انسانیت کی فلاح کی خاطر کام کرتے رہینگے۔ یہ حزب اللہ کی تحریک میں بھی شمولیت ہے۔ سپاہی کبھی احکام کو پس و پشت نہیں ڈالتے۔ کبھی اپنی راہ سے نہیں ہٹتے۔ اور پھر اللہ کے سپاہی!۔

ہم نے کافی وقت گنوایا ہے۔ ہم آج تک بے یقینی کے ویرانوں میں بھٹک رہے ہیں۔ لیکن اب بھی، ورنہ تعلیم و تربیت دے کر نئی نسل کو ایک بہتر دنیا کی تشکیل کے لئے تیار کرنے کا وقت باقی ہے —— تھوڑی سی کوشش درکار ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

کاتب کی ضرورت

طلوع اسلام کے لئے ایک ایسے کاتب کی ضرورت ہے جو نسخ اور نستعلیق دونوں خوش خط لکھ سکے۔ معاوضہ معقول دیا جائیگا۔ بہتر ہو کہ ضرورت مند حضرات خود آکر ملیں۔

—— ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ —— لاہور ——

علم و بصیرت کی بارگاہوں میں

قرآنی دعوت فکر کے حقیقت آفریں شاہکار

ادارہ طلوع اسلام کی مندرجہ مطبوعات نے علم و بصیرت کی دنیا کو ایک نئی روشنی عطا کی ہے۔ مفکر قرآن کی کاوش فکر نے سالہا سال میں قرآن کے باب عالی سے جو گہرہائے آبدار حاصل کئے وہ ان مطبوعات میں بکھرے پڑے ہیں۔ انکے مطالعہ سے آپ بھی شاداب قلب و نگاہ کا سامان پیدا کیجئے۔ اس فہرست کے ساتھ ایک مطبوعہ کارڈ منسلک ہے ان مطبوعات میں سے جو کتب آپکو پسند ہوں وہ اس کارڈ میں درج کرکے ہمیں حوالہ ڈاک کر دیجئے۔ اور اس طرح انہیں گھر بیٹھے حاصل کر لیجئے۔

۱۔ اسلام کیا ہے؟ دین خداوندی کی حقیقت کشا تصویر اور نکھرا ہوا نقشہ۔ مفکر قرآن کی وہ اہم کتاب جس کا انتظار کئی سالوں سے ہو رہا تھا۔ قسم اول (اعلیٰ ایڈیشن) آٹھ روپے۔ قسم دوم (سستا ایڈیشن) چار روپے۔

۲۔ انسان نے کیا سوچا؟ انسانی فکر کی ساڑھے تین ہزار سال کی مسلسل کاوشوں کا نچوڑ۔ قیمت۔ بارہ روپے۔

۳۔ لغات القرآن (چار جلدوں میں) قرآنی الفاظ کا انسائیکلو پیڈیا۔ دین خداوندی کے عالم آرا تصورات

قیمت جلد اول۔ دوم و سوم ۱۵ روپے فی جلد۔ جلد چہارم ۱۲ روپے پورا سیٹ پچاس روپے

۴۔ سلسبیل۔ مفکر قرآن کے مضامین اور مقالات کا بصیرت افروز مجموعہ۔ قیمت آٹھ روپے۔

۵۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) دینی حقائق کے بارے میں نئی نسل کے قلوب و اذہان میں ابھرتے ہوئے سوالات کے اطمینان بخش جوابات۔ جلد اول آٹھ روپے۔ جلد دوم چھ روپے۔ جلد سوم چھ روپے

۶۔ طاہرہ کے نام خطوط (دو جلدوں میں)۔ ملت کی ہر طاہرہ بیٹی کے نام اسلام کا پیغام۔ جلد اول دو روپے۔ جلد دوم ڈھائی روپے۔

۷۔ قرآنی فیصلے (دو جلدوں میں) زندگی کے عملی مسائل کے بارے میں قرآنی حقائق کا دلنشیں مرقع۔ ہر جلد سوا تین روپے

۸۔ من و یزدان۔ خدا اور انسان کے باہمی تعلق کے بارے میں قرآنی تصور کی تفاصیل۔ قیمت دس روپے

۹۔ ابلیس و آدم۔ ملائکہ۔ جن۔ ابلیس۔ شیطان کی حقیقت قرآنی نقطۂ نظر سے۔ قیمت آٹھ روپے

۱۰۔ برق طور۔ صاحب ضرب کلیم اور اس دور کے انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ۔ قیمت چھ روپے

۱۱۔ شعلۂ مستور۔ مسیح علیہ السلام اور ان کی دعوت انقلاب کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی۔ قیمت چھ روپے

۱۲۔ الفتنۃ الکبریٰ۔ خلافت عثمانی سے متعلق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تاریخی تحقیق۔ قیمت۔ چھ روپے

۱۳۔ فجر الاسلام۔ اسلامی تاریخ کے دور اول کی کیفیات کا تفصیلی جائزہ (از علامہ احمد امین مصری) قیمت آٹھ روپے

۱۴۔ ضحیٰ الاسلام (اسلام پر کیا بیتی؟) اسی سلسلہ کی دوسری کڑی۔ قیمت۔ پانچ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۔ لاہور